

میں کہی فسانہ تم بھی کہانی

اقبال متین

- 1). AWARDED BY
A.P. Urdu Academy
- 2). AWARDED BY
U.P. Urdu Academy

افسانے

میر تقی خان بہار کی کہانیاں

اقبال متین
”کہانی“
کتاب نگر
نظم آباد (اے پی)
۵۰۳۰۱

نام کتاب :- ”میں بھی فسانہ تم بھی کہانی“

نام مصنف :- اقبال متین

تاریخ اشاعت :- ڈسمبر ۱۹۹۲ء

تعداد اشاعت :- (۵۰۰)

سرورق :- قیصر سرمست

کتابت :- فضل محمد

طباعت :- اعجاز پرنٹنگ پریس

پتے :- ”کہانی“ کتاب نگر - نظام آباد - ۵۰۳۰۰۱

نیشنل بک ڈپو - نظام آباد - ۵۰۳۰۰۱

اعجاز پرنٹنگ پریس چھتر بازار - حیدر آباد

حسامی بک ڈپو - چار کمان حیدر آباد

قیمت :- - - - R.P. Rs. 47/-

مستطاب

جُمْلہ حُقوقِ بَحقِ مصَنَّف مَحفوظ

یہ کتاب آئندہ پبلشنگ اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے تیار ہوئی

فہرست

افسانے	(صفحات)
انتساب	۷
(۱) یہ کس کی تصویر ہے؟	۹
(۲) کھڑکیاں	۲۹
(۳) کنول اور گندم	۴۷
(۴) گٹھری	۵۷
(۵) جہاں میں ہوں	۷۹
(۶) میں بھی فسانہ تم بھی کہانی	۹۹
(۷) گنجائش	۱۰۹

- (۸) جھوٹی سچائی ۱۱۷
- (۹) زمین کا درد ۱۳۴
- (۱۰) دھوپ ۱۴۹
- (۱۱) انکشاف ۱۶۸
- (۱۲) ایک طوفان دو بوندیں ۱۸۲
- (۱۳) ادھورا سوئسٹر ۲۰۵
- (۱۴) ایک خط یادوں کے نام ۲۲۰
- (۱۵) تعارف نامہ ۲۲۸

انتساب

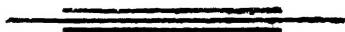
”میں بھی نہانہ تم بھی کہانی“ اس کے کرداروں کے ساتھ زمانے تک سبک رہی تھی۔ میرے دوستوں عابد سہیل اور بلراج درما کی محبتیں بھی اس کے آنسوؤں کا مداوانہ کر سکتیں۔ اس کتاب کو ”آگہی کے ویرانے“ اور ”مزیلہ“ ان دونوں کتابوں سے بہت پہلے شائع ہو کر اپنے وجود کا احساس دلانا تھا۔ لیکن مالی موانعات نے ہم تینوں کو بے کل رکھا۔

اب ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ فن کی زندگی کو ایک دہائی (ONE Decade) یا دو دہائیوں کے پیمانوں میں ناپنے والے زندگی کو کس زمرے میں رکھتے ہیں۔ میں تو صرف آشنا جانتا ہوں کہ کہانی جب جنم لیتی ہے تو زندگی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور زندگی

اپنی تجسیم کا عمل ایک جسم سے دوسرے جسم اور ایک ثنائے سے دوسرے ثنائے میں جاری و ساری رکھتی ہے۔ کہانی کا یہ تنفس بھی زندگی کی محزول و مسرور سالنوں ہی کا مڑوں منت بھی ہے۔ جزو لاینفک بھی۔
یوں نہیں ہے تو کہانی زندہ نہیں رہے گی اور اگر یوں ہے تو کہانی کو کوئی نہیں مار سکتا۔

میں اس مجموعے کو زندگی کے نام اور کچھ بلراج و رما اور عابد سہیل کے نام منسوب کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

اقبال متین



یہ
کیس کی

تصویر

ہے ؟

یس جو سامنے کی دیوار پر مستعطل نما بڑی سی تصویر ہال کے چوتھائی
 حصے پر پھیلی ہوئی ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ماڈرن آرٹ انسان کی
 شکل و صورت سے بہت آگے نکل کر اس کی اندرونی کیفیات اور جذبات کی
 آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ دعویٰ سارے کے سارے مجھے بکواس نظر آتے ہیں۔
 میں تنہا بیٹھا دسکی پی رہا ہوں، ویسے دمن جو، کا سارے کا سارا ہال تقریباً
 بھرا ہوا ہے، کتنے چہرے، کتنے تبسم، کتنے تعقے، کتنے سکون، سب خلط ملط ہیں۔
 ایک کو دوسرے سے جدا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میری تنہائی صرف اس معنی
 میں ہے کہ کوئی شریک بادہ و جام نہیں ہے، ورنہ میں انسانوں کی اس مسحور کن
 بزم میں شامل ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ تنہائی کا دور دور تک احساس البتہ
 نہیں ہے۔ صرف اس تصویر کا نہ سمجھ میں آتا ہی مجھے بار بار بادہ خواروں کی

اس بزم سے اگ تھلک کھ لیتا ہے ادیں شاداب چہروں، گنگناہ چہروں، اوہ اس چہروں گنگناہ چہروں اور ویران چہروں کی اس محفل سے پل دوپل کے لئے کٹ جاتا ہوں اور میرا جو داس تصویر سے چمٹ جاتا ہے۔

اس بڑی تصویر کو بہ یک نظر میں سمجھ نہیں پاتا ہوں تو اس کے مجموعی تاثر سے بالکل بے نیاز ہو کر جو مجھ پر سرے سے کوئی تاثر ہی نہیں چھوڑتی ہے، ایک ایک حصے کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سیدھی جانب یہ جو عجیب سا ایک ہیولی ہے شاید کسی غمزہ انسان کا مسخ شدہ چہرہ ہے۔ ہر ت کسی بھی آدمی کے ساتھ میخانے میں داخل نہیں ہوتی مدہ تو باہر ہی کھڑی اس کی منتظر ہوتی ہے۔ پھر یہ چہرہ اس تدریج کیوں ہے۔ جیسے ہم بجلی کے خزانہ پر خطرہ کے جلی حروف میں لکھ ہوئے لفظ کے نیچے پڑیوں کی مقراض کے درمیان انسان کے نیچے ہوئے چہرے کی صرف ہڈیاں دیکھتے ہیں اور کواہیت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے تصویر کے اس مسخ شدہ چہرے سے اسی قسم کی کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔ میری نظریں آہستہ آہستہ تصویر کے دوسرے حصوں کا طواف کر رہی ہیں لیکن سوائے دھندلے دھندلے چھوٹے بڑے دھبوں کے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا ہے۔ کوئی تصور اگر اس تصویر سے ذہن میں ابھرتا ہے تو وہ صرف بے سرو سامانی اور ٹی ٹی دنیا کا تصور ہے اور یہ تصور مجھے کچھ ادا اس کرنے لگتا ہے۔

میں ”من جو“ میں جب داخل ہوا تھا تو وہ ساری اداسیاں جو میرے جلو میں دبے پاؤں چلی آ رہی تھیں ”من جو“ کے دروازے پر اس طرح ٹھٹک کر

رک گئیں جیسے ان کی جیب خالی تھی اور میں اپنی جیب کے سہارے انھیں باہر چھوڑ کر
 ”من جو“ میں داخل ہو گیا تھا، لیکن جب میں نے وہ سکی کا دوسرا گلاس بھر لیا تو مجھے
 محسوس ہوا کہ یہ اداسیاں اس سامنے پھیلی ہوئی تصویر کے راستے ہال میں داخل ہونے
 کی کوشش کر رہی ہیں۔

میں نے جھنجھلا کر اس تصویر سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ — اور ”من جو“
 کے ہال میں بھی ہوئی انسانی چہروں کی رنگارنگ بزم میں شامل ہو گیا ہوں۔
 میری دائیں جانب قریب ہی کی میز پر تین نوجوان ریکارڈ پر بچتے ہوئے
 آکر سٹراکی دھن پر اپنے پیروں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کے جسم ایک
 خاص یکسانیت سے اپنے صوفوں پر تھرک رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ ان
 نوجوانوں میں جو سب سے زیادہ ڈنڈی بوائے ہے، وہی سب سے زیادہ خیف
 و ناتواں بھی ہے۔ اس کے چہرے پر جوانی کم ہے اور ڈنڈیاں زیادہ ہیں۔ ان کے
 بیر کے شیشے خالی ہو گئے ہیں اور گلاس بھرے ہوئے ہیں۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی عمر کا حساب کتاب لگا کر اس مقدار
 سے غاڑہ، سرخی اور لپ سٹک اپنے چہرے پر چھوپ رکھی ہے۔ جب ہال میں
 داخل ہوئی تو زیادہ جوان تھی لیکن شراب کی گرمی سے جیسے اس کا غاڑہ اور سرخی
 پگھل رہی ہے اور اصلی قد و خال نمایاں ہو رہے ہیں، اس کے ساتھ جو نوجوان ہے
 ہے وہ اس ادھیڑ عورت میں زندگی ڈھونڈ رہا ہے۔ جیسے میں سامنے لگی
 تصویر میں ایک جہان معافی ڈھونڈ رہا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ ایک بڑی سی
 نوکری کی ٹوپی نے آؤں اور اس عورت کے سر پر رکھ کر تالیاں بجاؤں۔

یہ شرارت مجھے یوں سو جھتی ہے کہ میں نے کہیں پڑھا — بیرونی
کے ایک سینما ہال میں اکثر عورتیں، نگا دنگ ٹوکری نما ٹوپیاں پہنے جب اپنی اپنی نشستیں
سنبھال لیتیں تو پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں اور اسکرین کے درمیان ان کی
یہ ٹوپیاں حائل ہو جاتیں اور پکچر انھیں دکھائی نہ دیتی۔ جب ان لوگوں نے نظمیں
سے شکایت کی تو سینما ہال میں اس مضمون کا بورڈ لٹکا دیا گیا۔

”صرف بورڈ ہی خواتین ہیٹ پہن کر سینما دیکھ سکتی ہیں“

اور اب — وہاں کوئی عورت ہیٹ پہن کر سینما نہیں دیکھتی

ہے۔

میں سوچتا ہوں مرد آخری سانوں تک عورت سے چمٹا رہتا ہے اور
اسی لئے عورت آخری سانوں تک صرف جوانی سے چمٹی رہتی ہے۔

میری نشست کے بالکل مقابل جو میز دھری ہے، اس پر کوئی سابقہ
فوجی انسر اپنے ”ایکس کیپٹن“ ہونے پر اس طرح فخر کر رہا ہے جیسے اب
بھی مادر وطن کی آزادی کا سارا بوجھ اسی کے کندھوں پر رکھا ہے اور بیرونی
بھری ہوئی اس کی بوتل کوئی ایسا نوکلیر تھیار ہے جس سے یہیں بیٹھے بیٹھے وہ
مادر وطن کی مدافعت کر سکتا ہے۔ اس ”ایکس کیپٹن“ نے اپنی کپتانی سے کچھ زیادہ
ہی جڑھالی ہے۔

میں اب صرف اس کپتان میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ تصویر
کی جانب میری نظریں اب اس طرح اٹھتی ہیں جیسے دیوار کی جانب مریض
کی نظریں اٹھ رہی ہوں۔

کی نظریں اٹھ رہی ہوں۔

ادھیڑ عمر کی عورت اور نوجوان مرد ابھی تک سرگوشیاں کر رہے

ہیں۔

طبری لڑکے کسی انگریزی لئے کی دھیمے سروں میں نقل کر رہے ہیں۔ لیکن میری نگاہوں کا مرکز وہی سابقہ کپتان ہے جو اپنے سلمے بیٹھے ہوئے کسی نواب زادے سے سینہ تان کر باتیں کر رہا ہے۔

یہ نواب زادہ اپنی پوشاک اور اپنے چہرے بشرے سے دن بھر میٹھن پر کام کر کے تھکا ہوا درزی دکھائی دیتا ہے لیکن سابقہ فوجی افسر اور نواب زادہ ایک دوسرے کی ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں ان دونوں میں کوئی قدر مشترک ڈھونڈ رہا ہوں۔

یہ فوجی افسر بڑی معصوم باتیں کر رہا ہے۔ وہ بار بار دہری نما نواب زادے کو اپنے قریب گھسیٹ کر کہتا ہے۔ ”وہی آدم سو لجزز“۔ ہم فوجی ہیں۔ اور بقتل سے اپنے گلاس میں اس ادا سے بیراضہ لیتا ہے جیسے ریپالور کی تیسری گولی چلا رہا ہو۔

نواب زادے کے سوال پر کہ آیا اس نے دوسری جنگ عظیم میں

حصہ لیا تھا؟

سابقہ کپتان بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔ میں نے کبھی کسی

جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اور اس طرح سینہ تان کر بیر کا گلاس اٹھاتا ہے جیسے دنیا بھر کے ہر فوجی سے صرف اس ایک خصوصیت کی بناء پر

خود کو ممیز کر رہا ہو۔

نواب زادہ لیکن تلاً ہوا ہے کہ فوجی کپتان کنی نئی دوستی بہر
نخر کر سکے۔

کوئی ایسا واقعہ اپنی فوجی زندگی کا سنا ہے جس میں آپ کی جان پر
بن گئی تھی؟

میں جھک کر ایش ٹرے لینے کے بہانے ذرا اود کھسک کر ان دونوں
سے ممکنہ قرب حاصل کر لیتا ہوں۔ فوجی افسر اتنا معصوم نہ ہوتا تو اس
سوال کے جواب میں یقیناً اس کی جان پر بن گئی ہوتی۔ لیکن وہ کہنا شروع کر دیتا ہے۔
جب میں رائڈنگ (Riding) کی ٹریننگ پارہا تھا ایک عجیب
غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک معجزہ۔ سوچتا ہوں تو آج تک حیرت ہوتی
ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا گیا۔ ”مجھے ایک بار بہت ہی
شرر گھوڑا دیا گیا جو بے قابو ہو رہا تھا۔ میں کوشش کر کے تھک گیا
لیکن وہ قابو میں نہ آیا۔ آخر شش میں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اب
جہاں اس کا جی چاہتا وہ مجھے لے کر بھاگتا۔ میں بس اس کی پیٹھ کا ایک
حصہ بکھر رہا تھا۔ وہ بھاگتا بھاگتا ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جب
بہت بلندی پر پہنچ گئے تو میری نظر پاس ہی کی ایک گہری کھائی پر پڑی جس
کے بچوں پچ ٹرین کی پٹریاں چمک رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب موت ہی
مجھے اس گھوڑے کی سواری سے بچائے گی۔ میں نے آخری بار اس کا رخ
موڑنے کے لئے باگ کو کئی جھٹکے دیئے۔ لیکن گھوڑا اس کشمکش میں اود بھی پھر

گیا اور کھائی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر میں نے دیکھا — نیچے بہت نیچے ترین رینگ رہی ہے اور اس کا دھواں سگریٹ کا دھواں معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے بعد، میں اور گھوڑا بلندی سے شاید نیچے آ رہے تھے مجھ پر غشی طاری تھی۔“

”آنکھ کھلی تو لوگ مجھے ہوش میں لانے کے جتن کر رہے تھے۔ طرہ بہ طرہ ہری ہوئی تھی۔ مسافروں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ جب مجھے پوری طرح ہوش آ اور گارڈ نے سہارا دیکر مجھے اٹھایا تو میں نے دیکھا، گھوڑے کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔“

درزی نمانواب زادے نے فوجی افسر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور بڑے پیار سے انھیں دبا کر مبرا رکھا دی۔ اور کہا — واقعہ کارنامہ ہے۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اگر یہ کارنامہ ہے تو خدا سے بزرگ و بڑے تر ہے یا گھوڑے کا یا فوجی افسر کا۔

درزی نمانواب زادے نے پھر کسی بات پر اس بات کا اعادہ کیا کہ اسلم جنگ کا شہید و معروف پل اسی کے دادا کے نام سے موسوم ہے جس کا پوتا ہے۔

میرے ذہن میں جلنے کیون خیال آیا کہ درزی نمانواب زادہ، سینہ دادا کا پوتا ہے یا اسلم جنگ پل کا پوتا — لیکن ادھر نواب زادہ نے یہ معنی سینہ تان رکھا تھا ادھر سابقہ فوجی افسر نے — اور میں دیکھ رہا تھا کہ

ان تھے ہوئے سینوں کے درمیانی فصل میں جو میز حامل تھی وہ دراصل نواباں کے
کے اسلاف کو فوجی افسر کے مرحوم گھوڑے سے مل رہی تھی۔

ایک تہقہہ اٹھتا ہے اور بال کے آخری کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو
میں ایک نئے آدمی کا سواگت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں میری میز سے یہ لوگ
اتنی دور تھے کہ میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ کانوں کے فرائض بھی آنکھوں کے
سپردہ کے میں اس نتیجہ پر پہنچ سکا تھا کہ یہ لوگ اسی بات پر نہیں رہے تھے جس
بات پر میرا جذبہ ترجمان ہی میں سے ایک آدمی میں ابھرا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ
اس دیر طرہ دو گھنٹہ کے دوران یہ آدمی جس کے گال پچکے ہوئے تھے کوئی بارہویں
بار لاٹری میں ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ایک رکیک سا خیال آیا ہے۔ ایک
گندہ سا تصور ابھرا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ لیکن ٹھہریے اس کو پڑھ
بغیر گذر جائیے۔

اگر یہ پچکے ہوئے گال والا آدمی مرجلے تو اس کی کھائی ہوئی لاش
کو اٹھانے سے اس کے ٹیلے اور بھیکے ہوئے کفن کے باعث لوگ اس لئے احتراز
کریں گے کہ ڈولے میں اس کا پیشاب ٹپکتا ہے گا۔

اور اگر اس کو جلایا جائے تو کڑیاں بجھ بجھ جائیں گی۔
لیجئے وہ پھلٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ پھر ہنسنے لگے اور وہ
جھومتا ہوا لاٹری کی جانب روانہ ہو گیا۔

میری میز کی شفاف سطح پر دھرے ہوئے گلاس اور شیشوں کا دھنلا
عکس میرے ذہن میں کسی ایسی چیز کی یاد تازہ کر رہا ہے جس سے میں کبھی

وائف تھا۔ لیکن وہ کیا بات تھی، وہ کیا شے تھی، مجھے کچھ یاد نہیں، اور اُس یاد کے یہ نقوش اتنے ہی دھندلے ہیں جیسے میز کی سطح پر شیشوں کا عکس۔ لیکن مجھے جانے کیوں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ میز پر چھائی ہوئی دھند سی میں نے ابھی ابھی کہیں ادھر بھی دیکھی ہے۔

ادھیڑ عمر کی عورت پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنی لب اسٹک دست کر رہی ہے۔ اس کا جوان ساتھی اس لب اسٹک کو شاید اس کے اپنے ہونٹوں پر پھیلا ہوا دیکھنے کا منتظر ہے اور میں ابنا کوئی ٹوکری نہا ٹوپی اس عورت کو پہنانے پر رائل نہیں ہوں۔

ٹیڈی لڑکے ٹڈوں کی طرح زیادہ اچھل کود ہے ہیں۔ میرا میرے آگے سے مرغ کی ایک ڈش لے کر ابھی ابھی گزرا ہے اور میرے نتھننے بھرک ہے ہیں۔

مجھے اپنی بیوی یاد آ رہی ہے۔ جو مجھ سے کہا کرتی ہے کہ تم اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر رہو بھی تو جلتی ہوئی دال اوداغ لگے ہو، چاولوں کی بو پر اس طرح چونک کر شور مچاتے ہو جیسے میز پر بیٹھے ہانڈیاں بھون رہے تھے۔ میری بیوی کی ناک مثالی حد تک خوبصورت ہے۔ ستواں سجیلی جس میں ایک جگمگاتی، جھل مل کرتی، کیل، پینانے کی مجھے بڑی حسرت ہے۔ لیکن میری بیوی کو میری قوت شامہ پر بڑا اعتماد ہے۔ رات کی دکھی ہوئی کوئی آثران ہو تو وہ بلا تکلف میری طرف بڑھا دیتی ہے اور بس ذرا سا مونگھ کر تصدیق کر دیتا ہوں کہ ہاں یہ چیز اتر گئی ہے۔

اس وقت جبکہ ہیرا مرغ کی ڈش لے کر میرے آگے سے ابھی
 ابھی گزرا ہے اور میرے نکتھنے اس مرغ کی خوشبو سے بھرک رہے ہیں تو میرا
 جی چاہتا ہے کہ میں اتنا شور مچاؤں کہ جہاں جہاں مرغ پلیٹوں میں رکھے ہیں سب
 کے سب ایستادہ ہو کر بانگ دینے لگیں — لیکن مجبوری ہے — میں کیسا
 کر سکتا ہوں۔ ”من جو“ میں شور مچانا میرے بس سے باہر ہے اور میں احتجاجاً
 اپنا خالی گلاس بھر لیتا ہوں۔

پیتے وقت مرغ سے بڑھکر کوئی چیز لذیذ نہیں ہوتی اور پینے کے
 بعد عورت سے بڑھکر کچھ بھی نہیں ہوتا — پہلی بات میں کرتا ہوں اور دوسری
 بات لوگ کرتے ہیں — اور اگر دونوں ہی باتیں میں کرتا ہوں تو کبھی ایسا
 کیسا فرق پڑتا ہے۔

میں نے اپنے بھرے ہوئے گلاس سے ابھی دو تین ہی گھونٹ پیئے
 ہیں۔ میری نظر ایک نواز پر پڑتی ہے۔ ادھیر عمر کا یہ شخص بہت ہی جاذب نظر ہے۔
 چہرے کے سیکھے نقوش کہہ رہے ہیں کہ مجھے کبھی پیانا گیا ہے۔ مجھے اس آدمی کو دیکھ کر
 اس شاندار عمارت کے کھنڈر یاد آ رہے ہیں جس میں میں نے کبھی اپنی محبوبہ سے ٹوٹ
 کر محبت کی تھی اور آج وہی محبوبہ میری بیوی ہے۔ مجھے شاید کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ آج میں
 خود اسی شاندار عمارت کا جیسے کھنڈر ہوں اور میری بیوی آج بھی اسی کھنڈر میں میری
 منتظر ہے۔ معاشی خوش حالی نصیب نہ ہو تو عاشق شاید اپنی محبوبہ کا شوہر بننے کے بعد
 کچھ اسی طرح سوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ کچھ سوچتا ہی
 نہیں۔ لیکن میں ابھی اپنے گھر کی دھڑکتی سے اس قدر بلند نہیں ہو سکا ہوں۔

اس شخص کی جاذب نظر شخصیت سے زیادہ میں جو اس میں دلچسپی
 لگا ہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی بوشرٹ پشت پر نمایاں طور پر
 ہوئی ہے اور وہ اس کی بوسیدگی سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ اطمینان سے ہا
 درمیان سے گذرتا ہوا کاؤنٹر تک پہنچ جاتا ہے۔ کتنی ہی نظریں اس کے چہرے
 سے زیادہ اس کی پھٹی ہوئی بوشرٹ میں پناہ لیتی ہیں جیسے اپنے احساس برتری
 پھیلنے کے بہانے دراصل ظاہر کر رہی ہوں۔ وہ کاؤنٹر پہنچ کر سارے ہال کی جانہ
 پشت کئے بیٹھ گیا ہے اور بڑی سنجیدگی سے گلاس میں دم حاصل کر چکا ہے۔ حج
 اس کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے لیکن بوتل پر جلی حروف میں لکھے ہوئے دم کو پڑھ
 لیتا ہوں۔ جب کاؤنٹر پر وہ اس کو دی جا رہی تھی — تب ہی تو میں جان رہا
 ہوں کہ وہ دم پی رہا ہے۔

درزی خانو اب زادہ فوجی افسر کو اشارے سے اس نووارد کی بوشرٹ
 بتلا رہا ہے لیکن فوجی افسر کی آنکھوں میں تضحیک کا وہ پہلو نہیں ہے جو نواب
 چاہتا ہے۔

میری نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت اور اس کے
 جوان ساتھی پر پڑتی ہیں جو بیر اکو آواز دے کر بل ادا کر رہا ہے۔

سو دے کا نوٹ دیکھ کر عورت کی آنکھوں میں چمک آگئی ہے
 اور وہ زیادہ دلکش نظر آنے لگی ہے۔ یا پھر یہ عورت جوان تو نہیں
 ہے۔

میری نظر میں سارے ہال کا طوائف گر۔ یہ تصویر اب تک پہنچتی ہیں —

میں حیران رہ جاتا ہوں۔ بالکل شدید۔ تصویر میری سمجھ میں آگئی ہے۔ بڑے سے کینوس پر پھیلے ہوئے اتنے سارے کے سارے ہیوے سمجھی تو میری نظروں میں بالکل واضح ہو کر اپنے ایک خط کو میری اپنی ذہنی کیفیت تک جیسے خود بخود لے آئے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کچھ ہی دیر پہلے اپنی میز کے شیشے کی شفاف سطح پر اپنے نگاروں اپنی بڑی، پلیٹ، الیش ٹرے اور چمچوں کا دھندلا سا عکس جب میں نے غیر ارادی طور پر ایک خاص زاویے سے دیکھا تھا تو مجھے خیال آیا تھا کہ بالکل یہ منظر میں نے ابھی ابھی اسی ہال میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید میرے تحت الشعور میں سی ہوئی یہ تصویر لمحہ بھر کو میرے شعور سے ٹکرائی تھی لیکن جانے پھر کہاں گم ہو گئی۔ اد اب جبکہ میں چوتھا پیگ ختم کر رہا ہوں۔ اب جبکہ ڈارلنگ دوسری اپنی ساری مستیاں مجھ میں منتقل کر رہی ہے اب جبکہ میں جاگنے کی سرحدوں سے بس کچھ ہی آگے نکل کر بوجھل ذہن کو سبک محسوس کر رہا ہوں۔ اب جبکہ مجھے 'من جو' کا ماحول زیادہ دیکش لگ رہا ہے۔ اب جبکہ میں نے ادھیر طرعم کی عورت کی آنکھوں میں جوانی کا نشہ محسوس کیا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ وہ تصویر تو میرے اپنے میز کی تصویر ہے۔

— چار پیگ، پانچ پیگ، چھ پیگ — پی لینے کے بعد یہ تصویر من جو کے ہر میز کی شفاف سطح کی تصویر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے پ کو وہاں تک آنا پڑے گا جہاں اب میں ہوں۔

میں اٹھ کر لاڈلری کو جانے کے بہانے تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھوں۔ پھر میری نظر 'من جو' میں بکھرے ہوئے میزوں پر پڑتی ہے۔ یہ تصویر تو من جو کے خوبصورت ہال میں چاروں طرف بکھری ہوئی ہے — میں سوچتا ہوں

لاٹری کے بلند دعووں پر استہزاء کرنے کا حق آخر مجھے کس نے دے دیا تھا اور اب یہ حق کس نے چھین لیا ہے۔

نوادردمن جو کی اس بزم بادہ گساراں سے بے نیاز سب کی جانب پشت کئے کاؤنٹر پر بیٹھا تیزی سے دم پی رہا ہے۔ اس کو نہ دیوار پر لگی تصویر سے کوئی واسطہ ہے نہ ”من جو“ میں بکھری ہوئی میزوں کی اصلی تصویروں سے جن کو کسی آرٹسٹ نے دیوار کے کینوس پر ابھار کر مقید کر لیا ہے۔ نہ ان انسانی جیتی جاگتی تصویروں سے جن کے پورٹریٹ صوفوں پر ہال میں چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ لاٹری میں مجھے پچکے ہوئے گالوں والا وہی شخص نظر آتا ہے جس کی نسبت میں نے سوچا تھا کہ اگر اس کو دنیا یا جائے تو اس کا کفن تر ہے گا اور جلایا جائے تو چٹا کی آگ بجھ جائے گی۔ اب یہ شخص قریب قریب لڑکھڑا رہا ہے۔ میں جب لاٹری سے نکل آیا ہوں تو اس کے ساتھی اس کو لینے کے لئے لاٹری میں داخل ہوئے تھے اور پھر یہ جو گنتی میں چار ہیں۔ چار دلدیشوں کی طرح ”من جو“ سے باہر نکل جاتے ہیں۔

میں لاٹری سے نکل کر اپنی میز پر پہنچنے تک پھر اس تصویر کے زندہ اور بولتے ہوئے آرٹ سے لطف اٹھاتا ہوں۔ یہ محسوسات کی تصویر ہے جو ذہن کی گرفت میں آکر نکل جاتی ہے۔ اس پر تھم تھم کر اچھٹی ہوئی نگاہیں ڈالنا چاہیے غم سے مکتے لینے سے اس تصویر کا حسن متاثر ہوتا ہے جیسے احساس مجروح ہوئے ہوں۔ اس تصویر کے حسن کے تاثر کی عمر احساس کی عمر کی طرح مختصر ہے۔

مخیلا بھال — مخیلا بھال — یہ بالکل نئی آواز ہے جو میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ میرے بائیں کوچ میں میرے لادوڑی سے لڑنے تک ایک بہت ہی عجیب و غریب شخص بڑی تمکنت سے آبراجتا ہے۔ آپ اس تمکنت کی مقدار تفصیل سے سنیں تو یقیناً کراہیت محسوس کریں اور مجھ سے ہمدردی کا جذبہ آپ کے ذہن میں بیدار ہو جائے کہ مجھ ناچیز پر اس آنکھوں دیکھنے نظر سے کیا گزری ہے۔ یہ شخصیت حوا بھی ابھی آپ کی اور میری توجہ کا مرکز بنی ہے، گنطور کی ایک بڑی رائس مل کی ملک ہے۔ رنگت کالی بھنگ، فرہی کا بوجھ اٹھا ہوا دھل ہوئی عمر۔ پیٹ کچھ ایسا ٹنکتا ہوا، جیسے بڑے سے بیلوں کی آدھی سے زیادہ ہو، اس کا رخ کردی گئی ہو۔ پیر پھیلا کر وہ کچھ اس طرح صوفے پر بیٹھ گیا ہے کہ اس کی دھول کا ایک سراسر اس کے پیروں میں الجھ کر نیم وا ہو گیا ہے۔ اس کی ایک ٹانگ رانولڈ سے اوپر دوڑ تک لنگی ہو گئی ہے۔ اس دودی کے تصور میں مجھ سے آپ کا جذبہ ہمدردی ابھر جانا چاہیے کہ میری آنکھوں پر کیا گزری ہوگی۔

مجھے چونکہ تلگو نہیں آتی ہے اس لئے میں انگریزی میں اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔ اس سے گزارش کرتا ہوں کہ اپنے بدن کی رعنائیوں پر تھوڑا سا اختیار رکھ لیں وہ مجھ سے کچھ اس طرح اور ذرا میں مخاطب ہوتا ہے۔

» نکو نکو انگریجی میں نکو۔ نیس آتا، جراجرا اردو میں آتا۔ «

میں اردو کی اس مقبولیت سے دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں اس سے انجا کرتا ہوں کہ وہ ٹھیک سے بیٹھ — میرے ہاتھ کے اشارے پر اس کا آنکھیں اپنا نیم برہمن منظر دیکھتی ہیں اور وہ بڑھاپے نیازی سے دھوقی برابر کر کے بیٹھ جاتا

ہے۔ جیسے یہ تو معمول کی بات تھی، لیکن مجھ پر جو بیت لگی ہے سو بیت لگی ہے۔

گنگوڑ کے اس مل مالک کے مقابل اس کا ایک ساتھی جو وہیں کا زمین دار ہے بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں ہی بدستی کی حد تک پیٹے ہوئے ہیں۔ جب میں اپنی سیٹ سنبھال لیتا ہوں تو مل مالک مجھ سے قریب ہو کر پوچھتا ہے۔

”یاں ہندی باجار کی منجیلا بھان کو آپ جان کو ہیں؟“

وہ جو منجیلا بھان کی رٹ لگائے ہوئے ہے وہ یقیناً کوئی طوائف ہے

یہ بات ابھی ابھی میری سمجھ میں آئی ہے کیونکہ اس نے ہندی باجار کا حوالہ بھی دیا ہے۔

محبوب کی ہندی جسے آج کل لوگ ہندی بازار بھی کہنے لگے ہیں۔ اجازت یا نہ طوائفوں کی کالونی ہے۔ رائس مل کا مالک وہیں کی کسی منجیلا بھان کی بات مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

— وہ کہہ رہا ہے

”بنگلہ پر رہا ہے۔ آہا۔ آہا۔“

گو یا اس آہا میں — اس کا حسن، اس کی آواز، اس کی چھپلتا ہر شے کی تعریف ہے۔ جذبات کے لئے ہاتھ کے مخصوص اشارے کے ساتھ مل مالک کے ادا کئے ہوئے اس لفظ ”آہا“ کی معنوی بلاغت کو میں نے محسوس کر لیا ہے اور اس کی ایک ادھر اس میں دلچسپی لینے کو مجبور ہو گیا ہوں۔

نوجوان مرد اور ادھیڑ عورت جو مجھے اب جوان نظر آنے لگی تھی۔ ابھی

گئے نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے شاید اپنا بل ادا کر دیا ہے۔ میں نے ان کو ہال کے نیچے سے گذرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، لیکن جانے کب وہ لوٹ آئے ہیں یا پھر ہال سے باہر گئے ہی نہیں ہیں۔ اب یہ دونوں دوسرے کونے میں مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک اور جوڑے کے ساتھ بیٹھ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس نئے جوڑے کی پشت میری جانب ہے۔ میں چہرے نہیں دیکھ پاتا ہوں۔ چہرے تو کبھی کبھی کتاب کی طرح نظروں کے آگے کھل جاتے ہیں۔

میں رائس مل کے مالک کو بتا دیتے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں کہ میں ہندی بازار کی کسی منجیلا بھان کو نہیں جانتا۔ لیکن اس کے دل و دماغ پر منجیلا بھان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ اس کے ایک دوست کے ساتھ وہ منجیلا بھان کے بیگلے پر بہت دن پہلے گیا تھا۔ آج اس کے اسی دوست نے کو الٹی بار میں اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب وہ وہاں نہ آیا۔ تو یہ دونوں اس کی تلاش میں یہاں آ گئے ہیں۔ کیوں کہ بار کے آخری اوقات میں وہ اکثر ”من جو“ آتا ہے۔

پھٹی ہوئی بوشرٹ والا جاذبِ نظر مخوار کاوٹر سے اٹھ کر لاوٹری کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا چہرہ فروغ مے سے گلستاں بنا ہوا ہے۔ جب وہ ہال کے درمیان سے ہو کر گذر رہا ہے تو میں غور سے دیکھتا ہوں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر اس طرح باندھ رکھے ہیں کہ بش شرٹ کا پٹا ہوا حصہ اس کے ہاتھوں کے نیچے چھپ گیا ہے۔

بھرے ہوئے ہال میں بے شمار اور بھی لوگ ہیں اور ہر ایک میں دلچسپی لینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ پھٹی ہوئی بوشرٹ والا

یسی بن کر میرے قریب آجاتی ہیں۔۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے پوچھتی ہے۔
 ”تم اپنی دوسری کتاب میرے نام سے منسوب کر دو گے نا جب تک اس
 دنیا میں نہیں رہوں گی؟“

میں جمیلن کی بزم تصور میں زیادہ دیر تک رہنا نہیں چاہتا ہوں لہذا
 گویا وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔

جاوید نظر سے خوار ہال کے درمیان سے پھر کاؤنٹر کی جانب
 لوٹ رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ اسی احتیاط سے اپنی پشت پر باندھ رکھے
 ہیں اور بوشرٹ کا پھٹا ہوا حصہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ کاؤنٹر کے قریب
 جا کر بھی اس نے اپنے ہاتھ اسی طرح پشت پر لٹکا رکھے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر
 وہ ایک کونے کی کرسی کی آڑ میں بیٹھ گیا ہے۔ اور اس وقت تک اپنے ہاتھ پشت
 سے الگ نہیں کئے ہیں جب تک کہ اس نے اپنی پشت دیوار کی جانب نہیں کر دی۔
 پیر کو آواز دیکر وہ اپنا گلاس کاؤنٹر سے اپنی میز پر منگو لیتا ہے۔

بھری بزم میں اپنی ذہنوں حالی کی تشہیر کرنے کے بعد اب یہ شخص آخر کن
 نگاہوں سے یہ سب کچھ چھپا رہا ہے۔۔۔ وہ کون ہے جو اس کی شخصیت
 میں اب تک سو رہا تھا اور اب بیدار ہو رہا ہے۔۔۔ جو کہ باکس کے پاس
 رکھا ہوا یہ زندہ پورٹریٹ اب میری سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ وہ تصویر تو محسوسات
 کی تصویر ہے جو ”من جو“ بار کے ایک چوتھائی ہال پر دیوار
 سے لگی ہوئی ہے۔ اور جو میری سمجھ میں آگئی ہے۔ لیکن میں اب اس زندہ
 تصویر کی دھجیاں دھجیاں شخصیت کو کن خط و خال سے ابھاروں۔ کن

نقوش سے اجاگر کر دے کونسا رنگ بھروں کہ پھیٹ ہوئی بوشرٹ سب کی نگاہوں
 سے چھپ جئے اور دل کے زخم تھک اٹھیں۔ کاش میں بھی کوئی آرٹسٹ
 ہوتا اور اس آدمی کے پورٹریٹ کے برابر اپنا پورٹریٹ رکھ کر اس سے کہتا —
 پہچانو — تم کون ہو؟ میں کون ہوں۔

کچھ کپیاں

میں اپنی نانی کے پاس کچھ ہی دن ہوئے شہر آئی ہوں۔ ضلع میں میں نے اپنی ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر لی ہے۔ یہاں مجھے کالج میں داخلہ مل گیا ہے۔

شام کو اپنی نانی کے ساتھ گھومنے پھرنے چلی تھی۔ بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کرتے دھڑ دھڑاتی تھی۔ جیسے زمین زمین نہ ہونے دو لٹا بکرا ہو اور میں اپنا توازن کھو بیٹھوں۔ آدمیوں کی اتنی بھڑ میں نے سنی تھی، دیکھی، کہاں تھی۔ رنگ رنگ کی موٹریں، بسیں، جیسے آنکھوں میں گھسی آئیں۔ اسکوڑوں پر اڑتی ہوئی لڑکیاں مجھے پر یاں سی لگیں۔ میں نے تصویر ہی تصویر میں کتنی ہی بار ان کی جگہ خود کو دیکھا۔ شہر کا بڑا بازار اونچی عمارتوں کی ایک تماشہ گاہ ہے جہاں میں خود کو بھول گئی ہوں۔ انجانے میں میں اتنا احساس ہے کہ میری نانی نے میرا ہاتھ تھام رکھا ہے اور میں زمین پر چل نہیں رہی ہوں ڈول رہی ہوں۔

وہ پاؤں جو ٹیڑھی ٹیڑھی پگھلنے لگیوں پر اڑتی ہوئی تیلیوں کی طرح دوڑتے تھے

تھ پر ڈھنگ سے اٹھنا بھی بھول گئے ہیں۔ وہ آنکھیں جو دھان کے لہلہاتے
 لگی، ہرے بھرے ٹیلوں کی شادابی، بہتی ہوئی ندیا کی روانی، ٹھنڈک، صبح کی
 سوپ کا سنہرا پن، شام کی فضاؤں میں بکھرا ہوا اجال اپنے گادوں سے سمیٹ
 بڑے بڑے پوٹریں اور اشتہارات اور دکانوں کے پورڈے پر چکر حیران ہو چکی
 یہ سورتیں، یہ اسکوٹروں کی پریاں، یہ سچی ہوئی دوکانیں، یہ آدمیوں کا چڑھتا ہوا دیرپا
 آج کے آج سارا شہر دیکھ ڈالوں۔ آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں ان کی موت
 میں طرح جیتا ہو گا۔ میں لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور میرا دواں
 اٹھتا ہے۔ اندھیرے — اطراف — اندھیرے — دور —
 — اُف —

نقشِ مراچوں اور آبِ خودِ دل کی دکان سجائے ایک نعیم نعیم عورت ہر راہ گیر
 ہی ہے۔ فٹ پاتھ پر اس نے ایسی جگہ چُن لی ہے کہ اس کے سجے ہوئے
 پر راستے کا بلب ہر رات چمکتا ہو گا اور بجلی کا کھمبا اس طرح بھی اس کی
 رہا ہے کہ وہ اس شانِ استغناء سے مسند نشین ہے جیسے فٹ پاتھ پر نہیں
 پر متمکن ہے۔ راہ گروں کا منہ ٹککنے میں اس کی آنکھیں اپنی بے بضاعتی کا
 کر رہی ہیں بلکہ فرہی کا بوجھ ہے جو لمبی ہوئی نظروں کو اٹھنے بھٹکنے سے
 ہے۔

میری نانی ایک صراحی کو الٹ پھیر کے دیکھ رہی ہے۔ یہ نقش کب تک پانی
 گئے پھر اس نے اپنی انگوٹھی کے نگ کو پھیلی کی طرف گھما کر صراحی کو بجانا
 ہے آواز بتا رہی ہے کہ صراحی میں کہیں پانی نہیں ہے۔

کوئی میرے برابر سے ہو کر مقابل میں آگیا ہے۔ جھگ کر اس نے بھی ایک
 صراحی اٹھالی ہے لیکن وہ صراحی کو دیکھنے کے بہانے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری نظر میں اس
 کی نظروں سے چار ہوش اور تین نظریں جھکالیں۔ لیکن میں چوری چھپے اسے دیکھ رہی ہوں
 وہ تو بس میرے چہرے پر ٹکٹکی جائے ہوئے ہے میری ناک کے نیچے اور ٹھوڈی سے اور
 پسینے کے قطرے چمکنے لگے ہیں میں جاہتی ہوں کہ یہاں سے نکل چلوں لیکن میری نانی نے سہ پہر
 صراحی رکھ دی ہے اور دوسری اٹھالی ہے اور پھر الٹ پھر کر ٹھونک بجا کر دیکھنے میں
 ہنہمک ہے۔ میں بھی اب صراحی میں دلچسپی لیتی ہوں تاکہ اس طرح مہبوت کھڑے رہے وہ
 اپنے ذہنی دیوالیہ پن اور اس بڑھاپے کو عیاں ہونے سے بچاؤں۔ — لیکن
 ایسا بھی کیا دیکھنا کہ بس پلک ہی نہیں جھپکتی — میں نے کن آنکھوں سے اس کو جوا
 کو پھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہر کر جیسے سب کچھ بھول گئی ہیں۔

میرے پاس صورت ہے جسم ہے۔ عمر ہے آنکھیں ہیں — کسی لڑکے
 کو اور چاہئے بھی کیا — مجھے بے شمار آنکھوں نے دیکھا ہے — اور میں خوشی ہوں
 کہ میں دیکھے جانے کے لائق ہوں — عورت دزد دیدہ لگا ہوں سے دیکھی جائے تو اند
 ہی اندر وہ پھول کی طرح کھل جاتی ہے لیکن چہرے پر اس شگفتگی کو اس وقت تک اس نے
 نہیں دیتی جب تک کہ وہ بار بار نہ دیکھی جائے۔ میں اس بات کو مانتی ہوں لیکن مجھے تو کچھ
 ایسی آنکھوں سے سابقہ پڑا ہے جو مجھے دیکھ کر پھر کچھ اور دیکھنا ہی بھول گئی ہیں۔

میں نے نانی کو ٹھوکا دیا — ”اے بھی چکونا“

لیکن اس نے صراحی پسند کر کے ایک طرف رکھ دی ہے اور ایک آب خوردہ
 اٹھالیا ہے اور وہ مجھے اس طرح دیکھ جا رہا ہے جیسے اس کی آنکھیں میرے وجود کو

تلاش بھی کر رہی ہیں، جھٹلا بھی رہی ہیں۔

اپنے صلیب میں اسکول آتے جاتے مجھے کتنی ہی آنکھوں نے دیکھا ہے —
اپنے گاؤں میں تو خود میری آنکھوں نے کتنی ہی آنکھوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہرا دیا
ہے — لیکن یہ انداز نظر ہی کچھ اور ہے۔ یہ نظر بجائے خود دیدنی ہے۔ میں تو
پشیمان سی ہو چلی ہوں۔ جیسے میرا اپنا کچھ دوش ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں ان نظروں
کی زد میں کیوں آ گئی۔

ایک عجیب سا خطرہ مجھ پر طاری ہونے لگا ہے۔ بوکھلاہٹ اور پشیمانی آہستہ
آہستہ خوف سے بدلنے لگے ہیں — اور میں نانی کے پیچھے سے گھوم کر ان کی دوسری جانب
پہنچ گئی ہوں تاکہ خود کو محفوظ محسوس کر سکوں۔ لیکن وہ آنکھیں عسکر لائٹ کی طرح مجھے
نوکس میں لئے میرے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہیں۔

میری نانی وہ مراحتی خرید لی ہے جو پہلے اس نے پسند کی تھی، باقی پیسے لوٹانے
کے لئے جب موٹو عودت نے اُلٹی سانس لے کر نفی میں گردن ہلا دی تو پھر مجھے نکلنے والی آنکھیں
گویا ہوئیں۔

”بچے میں جے دوں؟“

نانی نے نوٹ بڑھایا تو اس نے پس و پیش کیا۔

نانی نے اصرار کیا اور ہم جھٹکا دیا کر آگے بڑھنے لگے۔

شہر میں کسی شے کو بھولنے میں سنٹ دو سنٹ سے زیادہ دیر نہیں لگتی —
یہی آنکھیں مجھے اپنے گاؤں میں ملیں تو کوئی فیصلہ کن بات ہو ہی جاتی۔ لیکن یہاں سنٹ کی
سطحیں کسی مسافر کا پاؤں پکڑنے کی رحمت ہی نہیں کرتیں — یہاں نہ نقشبند ہیں نہ

گوردکا بدال ہے — آدمی چلتا ہے، چلتا ہے نہ پیچھے آنے والوں کے لئے کچھ چھوڑتا ہے نہ خود اس کے لئے کسی کے نقش کھ پا چکے اُٹھتے ہیں — امد پھر بھڑکا یہ عالم ہے کہ چھوٹے ہوئے ہاتھ پھر نہیں ملتے۔

میں اسی لئے تو مطمئن تھی کہ چلو آگے بڑھ آئی ہوں۔ اب نہ پیچھے کچھ ہے امد نہ سامنے کچھ۔

نانی نے کتنی ہی چیزیں مجھے بتلائیں۔

اور جب میں چلتے پھرتے جنگلے میں سولہ ہو گئی تو میرا حق میں ڈول رہا تھا۔ نیچے چلتے ہوئے راہ گیر سائیکلیں، رکشے، موٹر میں سب ہی کچھ خیر اہم سے الگ سب سے تھے۔ مکانوں کی چھتیں گنج کی چنڈیا کی مانند چمک رہی تھیں۔

مڑکئی، بڑھتی، تھم تھم کر جب ڈبل ڈس کہیں ٹھہر گئی تو نانی نے مجھے جیسے جگایا ہم دونوں اُتر پڑے۔

”یہ آندھرا بینک ہے۔ یہ وومن کلار“

میں سوچ رہی ہوں — میرا تو یہیں یہ حال ہو رہا ہے — لوگ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں کیا کرتے ہوں گے۔

ٹھیلوں کی قطار میں میری نانی ایک جگہ ٹھہر گئی ہے۔ اس نے کہا: بتا کیا کھائے گی؟ پھر خود ہی چاٹ بنا نے کے لئے کہہ دیا۔

میں ہو ہو — سو سو کرتی چاٹ کھا رہی ہوں۔

میری نانی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میرے گال سرخ ہو رہے ہیں۔

میں تو اپنے بالوں کی اس لٹ پر جھلا رہی ہوں جو چاٹ کی وجہ میں آگری ہے

میں بے بس ہوں۔ ایک ہاتھ میں دو بے ایک جھوٹا ہے۔ نانی نے مسکرا کر میری لٹ کو اپنے پتھر سے صاف کیا اور تجھے بالوں میں اڑس دیا۔

میں پھر مزہ لے رہی ہوں — سو سو — ہوتو۔
 ”اب یہ کچوری کھالے۔“

پھر میں اور نانی غپ چپ کھانے لگے۔ بٹانے بھرا غپ چپ میں نے منہ میں رکھا اور مزہ لینے لگی۔ نانی نے کہا — ”تجھے اس ہوٹل سے کافی پلاؤں تو نیا میڈیکل کالج بتاؤں۔“

ہوٹل پر کافی بورڈ کی بڑی سی تختی لگی ہوئی ہے۔ ایک آدمی دھلے دھلا جگمگ کرتے صاف شفاف چھوٹے سے پیرل کی نلکی کھول کر کافی بھر رہا ہے اور ایک آدمی کو پیچ کر رہا ہے۔ نہ اس کے ہاتھ کو چین رہا ہے۔ نہ اس کے ہاتھ کو۔ میں نے دوسرا غپ چپ منہ میں رکھتے ہوئے غموں کیا جیسے پھر کسی خوف کی برجھائیاں میرے ذہن پر پڑنے لگی ہیں۔

میں نے ادھر ادھر جب نظریں گھمائیں تو شاید میری آنکھوں نے اچھٹے اچھٹے کوئی ایسا منظر دیکھا ہے — جس سے میں کبھی کچھ خائف ہو گئی تھی۔

میں پھر ایک پانی بھرا غپ چپ تھیلے والے کے ہاتھ سے لے رہی تھی کہ میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ وہ پھر اسی ڈھنگ سے مجھے تک رہا ہے۔ اب کی بار اس نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں چھپا رکھا ہے۔ شاید چاہتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتا ہے۔ لیکن میں سکونہ دیکھ سکوں۔ لیکن میں نے اس کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے اپنی نانی کو بتلانا مناسب سمجھا کہ وہ آدمی ہمارا بیچھا کر رہا ہے۔

میں نانی کے قریب ہو گئی۔ انھیں صورت حال سے واقف کرا دیا۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ وہ نوجوان کہاں کھڑا ہے۔ نانی نے جھٹ پٹ کھیلے والے کے پیسے ادا کئے اور میرا ہاتھ اس مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے میں خود بھاگ کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ ہم نئے میڈیکل کالج کی طرف بڑھے تو میری نانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور میں نے کن آنکھیں سے۔

وہ بھی ہمیں بڑھتا ہوا دیکھ کر بھیڑ میں کہیں غائب ہو گیا۔ لیکن میں اور نانی نئے میڈیکل کالج کے گیٹ میں داخل ہوئے تو وہ جیسے خوش آمدید کہنے کھڑا ہے۔

ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر کچھ وہ بھی بوکھلایا۔ میرے تو قدم زمین میں گر گئے ہیں شہر کی دھرتی جیسے کسی تہمت کا انتقام لے رہی ہو۔

نانی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے نظروں ہی سے چبا کر تھوک ڈالے گی لیکن وہ ہماری ان ساری کیفیات سے بے نیاز ہے۔ ہم پوجا بیت ہم ہی ہے سو بیت ہم ہی ہے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ جو کچھ بیت ہم ہی ہے سو اسی پوجا بیت ہم ہی ہے۔

ہم آگے بڑھ گئے تو نانی نے کہا۔

”منہ سے پھوٹا بھی تو نہیں گونگا ہو گا موائے۔“

میں نے نانی کو یاد دلایا کہ گونگا اونکا نہیں ہے۔ اس نے مزاحیہ فریختہ صحت دیرگاری پیش کی تھی۔ نانی کو یاد آیا تو وہ جھلا کر بولی۔

”ہاں جی یہ موائے بولتوں کی بولتی بند کرے ہے۔“

نانی کی اس بے بسی پر میں مسکرائے منانہ رد سکی۔ لیکن خوف کی پرچھائیاں

گہرے سایوں میں بدل رہی تھیں۔

ہم دوسرے گیٹ سے نکل کر بس اسٹینڈ کی طرف چلے ہیں تو نانی بڑی چوکنی
- وہ پلٹ پلٹ کر اور دائیں بائیں نظریں گھما کر برابر دیکھے جا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد
میرا بلا تھک دبا کر کہا — ”وہ پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔“

اسی اثنا میں بس سامنے اسٹینڈ پر آ کر رکنے کی تو ہم تیز چل کر ”کیو“ میں جا ملے
نے مجھے آگے کر دیا اور خود پیچھے ہو گئی کہ میں نظروں کے سامنے ہی رہوں۔

جب ہم بس میں سوار ہوئے تو اوپر کی منزل پر چڑھتے چڑھتے ہم نے دیکھا کہ
ی کیو میں کھڑا ہے اور بس میں سوار ہونے والا ہے۔

راستہ کس طرح گذر گیا مجھے کچھ کم کم احساس ہے۔ نانی اس قدر پریشان ہے
خود وہ ابھی ابھی شہر آئی ہے۔ اس کی اس پریشانی سے میں خائف بھی ہو گئی ہوں اور
بھی — خائف اسلئے کہ آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں اداس اسلئے کہ اگر وہ پیچھا
لیں تو جلنے کب تک میں شہر میں گھومتی پھرتی۔ یہاں تک کہ نانی تھک جاتی اور اس
یرشل ہو جاتے۔ مجھے تو کچھ نانی پر بھی غصہ آ رہا ہے۔ وہ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی ہے
جب اس کی بات بتلائی تھی تو میں سمجھتی تھی کہ نانی ان آنکھوں کو شعلہ بن کر جھلس
- لیکن وہ جیسے سٹھیا گئی ہے۔

ہمارے پاس گاؤں میں کسی لڑکی کی آنکھیں اگر وہ جاگتی رہیں تو دنیا بھر کا
بہر سکتی ہیں۔ یہاں شہر میں ایک مرد کی دوا آنکھوں نے ہمارے حواس گم کر دیئے ہیں
دیکھ رہا ہے تو دیکھتا رہتا — میرے لئے تو یہ نئی جگہ تھی — اس لئے تو
اس دیکھے جانے کو بھی گوارا کئے ہوئے تھی۔ ہمارا گاؤں ہوتا، یا پھر اس شہر سے

میں مانوس ہوتی تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی کہ دیکھو میری آنکھوں میں تمہارے لئے کتنی نفرت ہے۔

ہم گھر کے قریب پہنچ گئے اور نانی نے مجھے اٹھنے کو کہا — ہم بس پر سے اتر پڑے تو پھلی منزل سے وہ بھی اتر پڑا۔ وہ ہمارا ہی منظر تھا — ہم گھر کی جانب چلنے لگے تو وہ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا — پاس سے گذرتے وقت میں نے ہزار لگا ہوں سے اسے دیکھا بھی۔ لیکن وہ اس قدر مبہوت کھڑا تھا جیسے جا دو کے اثر سے نیم جاں ہو رہا۔ ہم آگے بڑھ گئے تو نانی نے پلٹ کر دیکھا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ نانی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
 ”آئے دو موڑے کو۔“ تم ڈرتی کیوں ہو۔“ گھر قریب آ گیا تھا تو مجھ میں بھی ہمت آگئی تھی ورنہ نانی نے سٹھپا کر رکھ دیا تھا۔

گھر کے دروازہ تک وہ برابر پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میں تو اس چھپکے سے اندر چلی گئی جیسے کوئی پردہ نشین خاتون سواری سے اتر کر راہ گیر کی نظر سے بچتی ہو۔ نانی پیچھے آئی تو کہنے لگی — موا کھڑا ہے تیرا ماموں آجانے دے ہڈیاں تڑا دوں گی۔“

میں بھی سوچ رہی ہوں کہ شہر کی ریت نیاری ہے کوئی لڑکا لڑکی کو تباہ رہا ہو تو لڑکی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور اپنے ماموں کے آنے کا انتظار کرتی ہے۔ گاؤں میں منٹ بھر میں وہ سمجھا دیتی ہے کہ مسافر راستہ بھٹک گئے ہو۔ اس کنویں کا ٹھنڈا پانی تمہارے لئے نہیں ہے۔ راہ لو اپنی۔

ماموں آتے نہیں — تغل کھلتا نہیں — اس کہاوت کے مصداق نانی نے مجھے بنگلے کی کھڑکی کھولنے دیتی ہے نہ سڑک کا نظارہ کر کے دل بہلانے دیتی ہے۔

ہمارے بنگلہ پر قطار سے تین کھڑکیاں ہیں۔ نانی کہتی ہے کہ جب جی نہیں لگتا تو وہ کھڑکی کھلی کر بیٹھ رہتی ہے اور اس طرح گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ میرا ماموں بھی کبھی کبھی دوسری کھڑکی میں بیٹھ رہتا ہے۔ اس کا گھنٹوں نہیں تو کچھ نہ کچھ وقت گزر جاتا ہے تیسری کھڑکی ایسے میں بند رہتی ہے یا پھر کبھی بھی رہتی تو خالی رہتی۔ اب یہ میرے حصے میں آئی ہے۔

پانی وضع کے اس مکان میں ان کھڑکیوں سے صرف ہوا آمد شدنی ہی داخل نہیں ہوتی بلکہ زندگی داخل ہوتی ہے۔ کھڑکیاں بند کر لی جائیں تو کمرے کی چھت پر بڑا سا کتبہ لگا دیا جاسکتا ہے۔

قبر جس میں تین آدمی دفن ہیں۔

مکان دراصل ہمارے قبضہ میں ہے نہیں — بچلا حصہ سارے کا سارا ماموں نے کرائے پر دے رکھا ہے۔ یہ حصہ اچھا خاصا وسیع ہے۔ چار دالان، چار کمرے، دو چھوٹے برآمدے، دو حمام، دو پخانے، ان دو حمام اور دو پخانوں میں سے ایک حمام اور ایک پخانہ تو ہمارے لئے مختص ہے۔ ماں نے دونوں ہی کے دروازوں پر تالے ڈال رکھے ہیں۔ یہ تالے لگ بھگ ماموں ہی کی عمر کے ہوں گے۔ ان کا کام لوگوں کو چکر دینا ہے۔ کوئی مائی کا لالہ ذرا سا جھٹک دے تو پیٹ سے کھل جاتے ہیں لیکن ہمارے کرایہ داروں پر ماموں کا بڑا رعب ہے۔

تو اس نچلے حصے میں چھ خاندان بستے ہیں۔ ایک ایک دالان میں ایک ایک خاندان آباد ہے۔ ایک خاندان نے دو کمرے لے رکھے ہیں اور ایک فعلی نے تو نیچے چوکنے ایک ہی کمرے پر اکتفا کیا ہے۔ ایک کمرہ مقفل ہے اور ایسا لگتا ہے کہ مدت سے اس کا

یہ ایک ذہین میں کوئی کوئڈہ سا لپکا اور مجھے خیال آیا، جیل کے بڑے سے چوکور وسیع احاطے کے ہر گوشے میں چار مکڑے بلندی پر بنائے گئے ہیں۔ جن میں سنتری بہرہ دیتے ہیں اور سارا جیل خانہ ان کی نظروں کی زد میں رہتا ہے۔ ہمارا یہ گھر بالکل اسی طرح کا چھوٹا سا جیل خانہ ہے۔۔۔۔۔ ماموں سنتری ہے اور نانی شخنہ شہر۔

اپنے ان کرایہ داروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کو نانی کبھی کبھی اس سمت کی کھڑکی کھول لیتی ہے جو گھر کے اندر کھلتی ہے۔ کبھی نیچے کو بلوہ ہوتا ہے، کرایہ دار آپس میں لڑ پڑتے ہیں یا عورتیں تو تو میں میں کرتی ہیں تو نانی کی اس اکلوتی کھڑکی کے پیٹ بڑے دھڑلے سے کھل جاتے ہیں اور لڑنے جھگڑنے والوں کی نظریں انصاف کی طالب ہو کر نانی کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ اب چونکہ یہ کھڑکی بند ہے۔ ہمارے بچے میں اندھرا ہے۔ سوچ کی اکا دکا کرنیں کسی سوراخ سے داخل ہوتی ہیں تو فرش پر جم چکی ہوئی سونے کا سکہ بن گئی ہیں۔

دن کا ابھی بہت بڑا حصہ باقی ہے۔۔۔۔۔ میں سوچ رہی ہوں۔ وہ شخص ہمارا بیچھا چھوڑے تو نانی کو اکسا کر، بہلا، مٹا کر، ہمت دلا کر پھر گھومنے پھرنے کے لئے نکل پڑوں۔

میں نے آخر تنگ آ کر نانی سے کہا۔ ”کھڑکیاں کھول دو نانی۔“ دیکھیں بھی وہ کھڑا ہے یا چلا گیا۔۔۔۔۔ وہ کوئی شیر تو ہے نہیں۔ جو ہمیں کھا جائے گا۔ ”ایسے مرد شیر سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں بنگلی۔“ نانی نے کہا۔ اس کی آواز مدہم ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”بچھے کچھ پتہ ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے دن دھاڑے ایک عورت کو دو مرد

سڑک سے اٹھا کر بھاگے ہیں۔۔۔ پھر ان میں چار مرد داخل گئے۔۔۔ اور آج تک وہ عورت لاپتہ ہے۔ اس کا میاں ہے اس کے بچے ہیں۔۔۔ اور پولیس تلاش کر رہی ہے۔“

میری قتل ٹھکانے لگی۔۔۔ میری بدھی سدھر گئی۔۔۔ تو وہ آنکھیں جو مجھے اس طرح تک رہی تھیں جیسے اپنا آپا بھول بیٹھی ہوں۔ اپنا پرایا بھول بیٹھی ہوں۔۔۔ وہ اتنی چال باز ہو سکتی ہیں۔۔۔ !!

میں سوچ رہی ہوں کہ ماموں آئیں گے تو اس موئے کو پٹیا ہوا دیکھ مجھے کسی قدر مزہ آئے گا۔ کاش ایسا بھی ہو سکتا کہ میں اور نانی اس موئے کو سڑک پر سے اٹھا کر کہیں لے جا سکیں۔

نانی نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر شاید ہمت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے تینوں میں سے ایک کھڑکی کھول لی ہے۔ یہ کھڑکیاں بنگلے کے فرش سے صرف ایک فٹ اونچی ہیں۔ اور وہ آور سے قد آند آدمی بھی اطمینان سے ان پر بیٹھ کر سڑک اور بازار کی سیر کر سکتا ہے۔

نانی نے مگر ایک ہی پٹ کھولا ہے اور دوسرے پٹ کی آڑ میں براجم غور سے نیچے سڑک پر دیکھ رہی ہے۔

”جلی گے تجھ پر منہ جلتی آ آنکھیں پھوٹیں تیری“ نانی بڑبڑانے لگیں۔
”بس حد درجے پر ٹھکی لگائے کھڑا ہے موا۔ آنے سے تیرے ماموں کو۔ دیکھ تو بھلا کیا کرواتا ہوں نواب کے جنے کو۔“

”بس اس کی آنکھیں پھڑا دو نانی۔ اور چھوڑ دو دنیا بھر کے اندھیرے میں

بھٹکنے کے لئے۔ اس کے لئے ہی بڑی سزا ہے۔ میں اس طرح کہا جیسے کوئی شہزادی
کسی غریب کی جہارت پر کو تو ال شہر کو اس کی آنکھیں نکلا دینے کا حکم دیتی ہے۔

لیکن میں چاہتی تھی کہ ذرا اس کو نظر بھر کر دیکھوں بھی۔ آخر وہ جس کی میرے
لئے ٹھکانا ہونے والی ہے اسے میں بھی تو دیکھوں کہ اس کا چہرہ ہی یاد ہے۔

میں نے بھی نانی سے پوچھے بغیر ہی دوسری کھڑکی کھول لی۔ لیکن اسی احتیاط سے
ایک پرٹ بند رکھا اور پرٹ کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔

”موا کہاں ہے نانی؟“

نانی نے مجھے بتایا ”وہ رہا ہوا۔ درزی کی اس دوکان کے چھبے کے نیچے۔ ہاں
وہی ابھی ابھی جس نے ہاتھ پر گھڑی دیکھی ہے۔“

وہ تو گھڑی دیکھ کر انتظار کئے جا رہا ہے جیسے کسی سے ملاقات کا وقت
لے رکھا ہو اور بے چین ہو۔

پھر ہم نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ نانی تو
بس اوسان کھو بیٹھی۔ اس نے لپک کر وہ کھڑکی کھول لی جو گھر کے اندرونی حصے میں کھلتی
ہے اور جہاں سے نانی کرایہ داروں پر کو تو ال کرتی ہے۔ اس کھڑکی سے دروازہ بہ آسانی
بائیں جانب نظر آتا ہے۔

لیکن وہ گردن جھکا کر سوچ میں گم ہوٹ رہا ہے اور میں اسے لوتا ہوا
دیکھ رہی ہوں اور میرے دل میں لڑو بھڑوٹ ہے ہیں۔ اب میں نے اطمینان کا سانس
لے کر کھڑکی کھول لی ہے لیکن اس نے چلتے چلتے پلٹ کر اس طرح میری جانب دیکھا
ہے جیسے میری آواز پر چونک اٹھا ہو۔ اس کی نظریں تو جھکنے کا موقع دیئے بغیر میری

نظروں سے چار ہو گئی ہیں اور میں زور سے کھڑکی بند کر کے غصہ کے اظہار کے بعد کھڑکی سے ہٹ آئی ہوں۔

ماسوں ابھی نہیں آئے ہیں ورنہ میں اپنے عاشق کی مرست ہوتی ہوتی دیکھ کر لطف اٹھاتی۔ یہ بھی عجیب طرح کی تشفی ہو گی کہ کوئی اپنے لئے جان کھور رہا ہے کہ اپنے لئے ہی کسی کے ہاتھوں دھنکا جا رہا ہے۔ اور ہم اور یہ کھڑکی میں بیٹھے اس کی نامرادی کا عالم دیکھ رہے ہیں۔

میں اور نانی چار پانی پر پڑ گئی ہیں۔ اور میں نانی سے باتیں کرتی کرتی سو گئی ہوں۔ ایک پل ہے اور میں نیچ پل پر تنہا کھڑی ہوں۔ نیچے ٹھاسٹ مارا ہوا پانی ہے پھر پھر دیکھتے دیکھتے یہ پانی ساکن ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے منجمد ہو جاتا ہے۔ پھر سب غائب ہو جاتا ہے اور دد بڑی بڑی آنکھیں اس منجمد پانی کی جگہ رک جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑی آنکھیں ہیں۔ پل پر کھڑی میں جھک کر دیکھ رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ ان آنکھوں میں کو دپڑوں۔ لیکن یہ آنکھیں ڈبڈبائے لگی ہیں۔ پھر آنسو آٹا آٹا کر آنکھوں میں بھر جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے آنکھیں کہیں غائب ہو جاتی ہیں اور ساکن پانی پل کے نیچے اپنی گہرائی کو چھپاتا ہوا تاحہ نظر پھیل جاتا ہے۔ یکایک پل میرے پیروں کے نیچے سے کھسکنے لگتا ہے۔ کچھ ہل چل سی محسوس ہوتی ہے۔ اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ پھر لمبے بھر کے لئے مجھے میڈیکل کالج کی عمارت دکھائی دیتی ہے جس کا ایک بڑا حصہ منہدم ہو گیا ہے۔ پھر وہ پل جس پر میں کھڑی ہوں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرنے لگتا ہے۔ اور میں حیرت مار کر پانی میں کود پڑتی ہوں۔ عین اس وقت یہ پانی آنکھیں بن جاتا ہے۔

اور — اور میں جاگ گئی ہوں۔ میری آنکھ کھل گئی ہے۔ نانی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ ”بدخواہی ہوئی ہے کیا۔ تو ابھی ابھی چڑ پڑی تھی۔“ لیکن میں چار پائی سے نیچے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔
 آنکھیں ملتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تو چار پائی ہے جسے میں پل بچھ رہی ہوں۔ اور میں ڈھونڈ کیا رہی ہوں آخر۔ یہاں تو صرف نانی ہے۔ اس کی آنکھیں ہیں۔ اور وہ تین کھڑکیاں ہیں جہاں سے صرف ہوا اور روشنی ہی نہیں زندگی بھی اس کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

میں مری ہوئی آواز میں نانی سے پوچھتی ہوں — نا، کہیں ماموں نے اسے پٹیا تو نہیں؟

اور پھر خود ہی اپنی آواز کی بازگشت سن کر خاموش ہو جاتی ہوں —
 اس لئے کہ نانی نے میری بات غسنی ہی نہیں ہے۔

کنول
اور
گشتم

ناریل کے جھاڑوں کی جھنڈ میں کہیں کہیں گہرے سائے بکھرے ہوئے ہیں کہیں کہیں سورج کی کرنیں ان سایوں کی ٹھنڈک پر لپٹ کر رہی ہیں اور زمین پر آ کر دھوپ کے دھبے بن گئیں ہیں۔ گرم دھوپ کے یہ روشن دھبے گھنے سایوں کی ٹھنڈک کو محروم کر رہے ہیں اور مجھے ان کی بڑھتی ہوئی تمازت کے تصور سے وحشت سی ہو رہی ہے۔ ابھی تک ہوا کے جھونکوں میں خنکی ہے جس سے مجھے سکون حاصل ہو رہا ہے۔

میرے بالکل مقابل کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ایک کیکر کا درخت کھڑا ہے جس کی پھلیاں سوکھی ہوئی ہیں۔ لیکن پتے بالکل ہرے بھرے ہیں۔ ایک مینا ابھی ابھی زمین پر اتر آئی ہے اور میرے وجود سے بے نیاز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس جھیل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جس کے سینے پر کنول ہی کنول تیر رہے ہیں مجھے اس مینا کا اس طرح زمین پر چلنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اس زمین نے مجھ پر عرصہ حیات

تنگ کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ اپنے قدم اس زمین پر سے اٹھالوں، ہواؤں میں ڈولوں اور بلند ہو کر فضا کی دستوں میں کھوجاؤں اور یہ مینا سب کچھ چھوڑ کر زمین پر اتر آئی ہے۔ میں نے ایک کنکرا اس کی طرف پھینک دیا ہے اور وہ ذرا سا اڑ کر رنگ برنگ پھولوں کے پودوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

لیکر کے درخت کے قریب ہی بھوکے درخت میں اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک لیکر کا درخت اور ہے۔ مجھے پیل کے گھنے سالیوں کی تلاش ہے جو یہاں نہیں ہیں۔ لیکر اور بھوکے درختوں کے درمیان ایک بچہ پڑی ہے جو دھوکے کے گرم دھبوں سے اس وقت بھی محفوظ ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ بہت دیر تک محفوظ رہے گی۔ اس بچہ کی پشت پرے رنگ کئی ہے۔ اس بچہ پر ایک آدمی گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کا رنگ کھلا ہے لیکن کپڑے بہت گندہ اور میلے ہیں۔ اس نے اپنی بوسیدہ قمیض کم اندر شاید کوئی تھیلی چھپا رکھی تھی جو اس کی پشت پر بچہ کے نیچے جھول رہی ہے۔ اس تھیلی کا رنگ زیادہ ہی گندہ ہے جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے پسینے کی کھار کو اپنا روپ بنا لیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس تھیلی میں جھانک کر دیکھوں کہ اس شخص نے کیا کیا دکھ لیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی انگلیاں بے تکلفی سے اس تھیلی میں گھسٹوں۔ میرا یہ بھی جی چاہتا ہے کہ اس تھیلی سے اشرفیاں برآمد ہوں۔ اور میں اس طرح حیرت زدہ ہو جاؤں جیسے بنیئے کی تجوی کو خالی دیکھ کر ہو سکتا ہوں۔ یہ آدمی میری ان سوچوں سے بالکل بے خبر سو رہا ہے۔ اور یہی کچلی تھیلی بچہ کے نیچے جھول رہی ہے۔

جھیل میں کنوئیں اتنی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں کہ بانی کہیں کہیں اس

طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح ٹھنڈے سالیوں میں گرم دھوپ کے دھبے مجھے اس وقت دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں صبح کو اول وقت یہاں آیا تھا۔ کنول سے ڈھکی ہوئی اس جھیل پر ایک خوبصورت سائیل ہے۔ پل کے اس سمت پر جھیل کا چھترہ ہے اس پر بھی عدد دور تک کنول ہی کنول بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن مٹھو بن شکر کے لئے جو راستہ بنایا گیا ہے وہ پل پر کھڑے ہو کر دیکھا جاسکتا ہے۔ پانی کا راستہ بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کے درمیان سے گذرتا ہوا بڑا جھلا لگتا ہے۔ مٹھو بن شکر ارشام کو غریب آفتاب کے وقت لوگوں کو سیر کے لئے لیکر نکلتا ہے اور پھولوں کی دھرتی پر ڈالتا ہوا پانی کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

کچھ بچے کچھ عورتیں اور مرد عقی راستے سے اس گوشہ تنہائی میں درگئے ہیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوا ان کی کہانی سننے کی خواہش میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس نضار کا سلا سکون آنے والوں نے درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ کہہ رہا ہے۔ دیکھ رہی ہو کنول کیسے بکھرے ہوئے ہیں۔ عدد دور تک کنول ہی کنول ہیں۔

ایک نوجوان ایک لڑکی سے مخاطب ہوا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہلوئے لیتے ہوئے پانی کا وجود ہی معدوم ہو گیا ہے۔ کسی بھی شے کی اصلیت کا اس طرح چھپ جانا انسانی زندگی کے لئے المیہ کی طرح ہے۔ کیا ہم کنول کے ان پھولوں پر ان پتیوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔۔۔؟

میں زخ پر سوئے ہوئے جس آدمی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اب نکھیں مل کر اٹھ بیٹھا ہے۔ بچوں، مردوں اور عورتوں کی یہ ٹولی خوش گپیاں رتی ہوئی آگے نکل گئی ہے۔ ایک بچہ میرے قریب آ کر دک گیا ہے۔ وہ ٹری

حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے ناؤ نمٹیں بن کی نب سفید کاغذ پر، غو
نقوش چھوڑ رہی ہے وہ ایک ایسے مسافر کے نقش قدم میں جو ریت پر چل رہا ہے اور
سراب کو سمندر جان کر اپنی تشنگی مٹانے بڑھ رہا ہے۔

میں جب نظریں اٹھاتا ہوں تو وہ ہم جاتا ہے میں مسکراتا ہوں کہ آدمی کے
دل سے آدمی کا خوف دور ہو سکے وہ بھی جو اب مسکراتا ہے اور اپنی بہن کو پکار کر
کہتا ہے۔

دیکھو غمگین! یہ شاعر ہے۔ بنی یہ بات سن کر میرے اور اس کے قریب آتی
ہے۔ کاغذوں پر ایک نظر ڈالتی ہے جو میرے سامنے دھڑکتے ہیں اور جن پر میں نے
پیپر ویٹ کے طور پر سگریٹ اور کارڈ کی ڈبیاں رکھ دی ہیں۔ یہ شارٹ ہینڈ ہے
جو وہ لکھ رہا ہے اور پھر دونوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اس
عشارہ میں جس میں سانس لے رہا ہوں۔ شاعری اور شارٹ ہینڈ میں کتنا فرق ہے
شاید اتنا ہی جتنا میرے دل اور انگلیوں کی پوروں میں ہے۔ کیونکہ کسبِ معاش
کے وقت مجھے ان دونوں میں کوئی ایسا خاص فرق بھی تو نظر نہیں آتا۔

بچہ پر بیٹھا وہ آدمی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے گہری غنیمت
سورہا تھا۔ سب نے بھی اس پر نظر ڈالی چھدری چھدری سی بو کوڑی کی داڑھی جس چہرے
پر مجھے اب نظر آئی ہے۔ وہ چہرہ اس بیماری سے بہت جلد مسخ ہو جانے والا ہے
جس کے آثار مجھے اس چہرہ پر صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ چہرہ اس آدمی کا
چہرہ ہے جو ابھی ابھی بچہ پر سورہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ میری طرف غور سے
دیکھتا ہے۔ لیکن میں اس کی طرف نظریں نہیں اٹھاتا۔ وہ چاہتا ہے کہ

اس کی طرف توجہ کروں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میری ذرا سی توجہ سے وہ میرے
 ب آجائے گا۔ اور پھر مجھ سے پیسے مانگے گا۔ کم از کم سگریٹ تو مانگ ہی
 گا۔ لیکن میری بے توجہی کے باوجود وہ میری طرف آ رہا ہے میں کن آنکھوں سے
 دیکھ چکا ہوں اور نظریں جھکا لیں ہیں۔ جیسے اس کی آمد سے بے نیاز
 ۔ وہ آ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ نظریں
 سا کر اس کا مکروہ چہرہ دیکھوں۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اپنے کاغذوں پر جھکا
 بھی نہیں رہ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔ مجھے اس کے گندے وجود کے
 با کا احساس تسار رہا ہے۔ آخرش میں اس کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ میری بیزاری لگا ہوں
 وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔

» کیا چلہتے ہو۔۔۔ میں رعونت سے کہتا ہوں۔

» کچھ بھی تو نہیں! وہ لوٹ جاتا ہے۔

میری جانب پشت کیے جھیل میں جھومتے ہوئے کنول کے پھولوں کو وہ دیکھ
 ہے۔ میں ان پھولوں کو دیکھ رہا ہوں۔ میری نظریں اسی تھاں کا طواف کر رہی ہیں۔
 ان اس کی نظریں بھٹک رہی ہیں میری آنکھوں کی بنیائی کو اس کی بنیائی سے کوئی گھن
 میں آئی ہوگی چہرہ کنول کے ان پھولوں پر جنہیں میں دیکھ رہا ہوں اس کی نگاہوں کے
 جھٹے سے ابھر آتے۔ مجھے تو صرف اس کے وجود سے گھبراہٹ ہے۔ ایک آدمی کو
 ب آدمی کے وجود سے گھن آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ یہ تو ابھی میری نظریں
 سے چار ہونے سے کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ میں بھی وہ سب
 ٹھ دیکھ لیا ہوگا۔ جو میں اس چھدری داڑھی والے مسخ چہرے کے آدمی میں دیکھنے

میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پل پر کوئی سرخ و سفید بوڑھا سفید سوٹ پہنے گذر رہا ہے۔ اپنے سفید بالوں کو اس نے ہندی چڑھا کر سرخ بنا رکھا ہے۔ جو سفید فلیٹ کے نیچے بکھرے ہوئے ہیں اس نے بغل میں کچھ کتابیں دوبارہ رکھی ہیں پل پر اپنی سوچوں میں گم سم خراماں خراماں چلتا ہوا یہ سفید پوش بوڑھا میری نظروں کو بھلا لگ رہا ہے میں اس بوڑھے کو میلے چمک چمک پٹروں میں سامنے خالی بڑی ہوئی پنج پر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں اور اس چھدری داڑھی کے منہ چہرے والے شخص کو سوٹ اور فلیٹ میں پل پر چہرل قدمی کرتا ہوا۔ میری انسان دوستی کے تصورات میلی دھجیوں اور نکھرے سھرے سوٹ کے درمیان ابھی اُلجھے ہوئے ہیں کہ وہ آدمی پھر میری طرف بڑھتا ہے جو پنج پر سوکر اٹھا ہے اور جس کو میں اپنے اصلی لباس میں اپنے قریب آتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بھرا جھن سی ہونے لگی ہے۔ وہ میرے برابر سے گذرتے ہوئے مجھ سے کہتا ہے پنج میں نے تمہارے لئے چھوڑی ہے۔ آرام سے وہاں بیٹھ جاؤ۔

میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہوں اور وہ چپ کا سا چلا جاتا ہے۔ میں مناظر کے اس حسن میں نظاروں کی اس خوبصورتی میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہوں۔

سطح آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتیوں پر کوئی خوبصورت سانپا پرندہ کیڑوں کے تعاقب میں چل رہا ہے۔

درختوں کے جھنڈ میں سڑک پر بھاگتی ہوئی ڈبل ڈیک کی جھلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان بموں میں سوار ہو کر کتنے ہی لوگ اپنے اپنے روزگار کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے۔

سطح آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتیوں پر خوبصورت سانپھا پرندہ بھی تو اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے جس کے تعاقب میں سیکڑوں پر درختوں اور موڑوں میں لوگ بھاگ رہے ہیں۔ پھر میں زندگی سے بھاگ کر اس گوشہ تنہائی میں کیوں چلا آیا۔ صرف اسی لئے کہ میرے بیدار ذہن کو میرے زندہ فن کو زندگی سے دور لے جا کر بہلا سکوں۔ تھپک کر آسودہ کر سکوں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اسے ملا سکوں۔ اگر کہانی کی تلاش مجھے یہاں لے آئی ہے تو میں وقت سے کٹ کر وقت کی کونسی کہانی لکھوں گا۔ زندگی سے بھاگ کر زندگی کا کونسا افسانہ تحریر کروں گا۔

بڑھتے ہوئے سورج نے مختلف زاویوں سے اپنی کرنیں مجھ پر پھینکی ہیں تو دھوپ کی حدت سے بچنے کے لئے میں نے وقتاً فوقتاً اپنا مقام بدلا ہے۔ اب میں جھیل سے بالکل قریب چلا آیا ہوں۔ میری داہنی جانب بلخ کا وہ بڑا بیل ہے جس پر سے سواریاں دوڑتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ سرشام یہاں بھی بڑی گھما گھمی ہوگی۔ جھیل میں بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کی طرح انسان سارے باغ میں بکھر جائیں گے۔ یہ گوشہ عافیت جہاں میں بیٹھا ہوں۔ آئیں فروٹ، خوائچے اور ٹھیلے والوں کی آماجگاہ ہوگا۔

میری توجہ یکایک بٹ جاتی ہے کوئی شخص جھیل میں اگر طرف بیٹھا ہوا سطح آب پر ڈول رہا ہے میں اٹھ کر دیکھتا ہوں ایک چھڑی سی ٹن کی ہلکی پھلکی ناؤ کے سرے پر اگر دوں بیٹھا ہوا آدمی جھک کر اپنے ہاتھوں سے پانی کو اپنی جانب سمیٹتا ہے اور ناؤ ہولے ہولے آگے بڑھتی ہے۔ یہ بلخ کا مالی ہے۔ مڑ جھلے

ہوئے کنول کے پھولوں کو اور سڑے ہوئے کنول کی پتیوں کو وہ یا تو نکال لیتا ہے یا انھیں پھر سے تازگی حاصل کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس کی ناؤ آگے بڑھ رہی ہے اور پانی کی پگڑی سی پیچھے چھوٹ رہی ہے۔

سلمانے والے چھوٹے پل پر جو جھیل کے بچوں بیچ ہے کوئی ٹولی بلا سکتے رنگ برنگے باسکٹوں سے آم نکال کر کھا رہی ہے۔ اطراف میں ادھر ادھر لوگ سسکے دار درختوں کے نیچے سستا ہے ہیں۔ بائیں جانب ٹین کی بڑی سی چھتری - - - - کے نیچے جس کی جالیاں ہری ہیں اور حاشیہ سفید، دو لڑکے ایک دوسرے سے گھٹم گھٹا ہیں۔ دراصل ان میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ سے وہ آم جھپٹ لینے کی کوشش میں ہے۔ جو ایک باسکٹ سے دوسرا لے بھاگا۔ وہ شخص جو بیچ پر سو کر آٹھا تھا اور جس کے قرب سے مجھے گھن آ رہی تھی ان بچوں کے قریب ہی کھڑا ہے اور انھیں جھگڑاتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ پل پر مگن ٹولی سے ایک لڑکی نکل کر ان گھٹم گھٹا لڑکوں کے قریب بھاگ رہی ہے۔ بچے نے آم ہوا میں اچھال دیا تاکہ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے بچ کر لڑکی کے ہاتھوں میں پہنچ سکے۔ لیکن درمیان میں سے اس سے چہرے والے آدمی نے آم اُچک لیا اور ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دوسری سمت بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ بچوں نے شور مچایا۔ پل پر مگن ٹولی متوجہ ہوئی ہے لیکن وہ بگسٹ بھاگ رہا ہے۔ مجھے اس کی تھیلی کا خیال آ رہا ہے جس کا رنگ انسانی پسینے کی کھار کا رنگ ہے اور جس میں جھانگ میں اشرفیہ دیکھنا چاہتا تھا۔

میں جس کہانی کی تلاش میں بھولوں کی اس نگری میں آ پہنچا تھا۔ یہ نگری بھی میرے اس شہر سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ جہاں ہونسیلی کے ڈبوں

سے انسانوں کا غول اپنے لئے غذا چاہتا کرتا ہے۔

اپنی درمی کو میں ابھی ابھی گھسیٹ کر ایک گھنے پیٹر کے نیچے لے آیا ہوں۔ میری تھوکوں اس درمی پر بڑھ گئی ہے اور ٹھنڈا میٹھا پانی بہہ نکلا ہے۔ چونکہ تھوکوں کی کارگاہیں نہیں ہے۔ پھر بھی ڈھکن کی وجہ سے میرے لئے بہت سا پانی بچ رہا ہے۔ پانی گرنے سے بے شمار چیونٹیاں جو درمی سے چمٹی ہوئیں ایک مسو کھی میٹھی روٹی کے ٹکڑے کو مرکز توجہ بنائے تھیں منتشر ہو گئی ہیں اور اس انتشار کے سبب میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کب سے میری اس درمی کے ساتھ ساتھ باغ میں نقل مقام کرتی رہی ہیں۔ چیونٹی کی ننھی سی جتان کے لئے یہ مسافت اس قافلے نے میری درمی پر طے کی ہے۔ میلوں کی مسافت ہو سکتی ہے۔ چیونٹی کی ہمت اور استقلال کا سبق میں نے چھٹی جات میں پڑھا تھا۔ تیمور لنگ نے چیونٹی سے سبق حاصل کیا تھا۔ لیکن میں نے اس قافلے کو اپنی درمی سے الگ کر دینا ضروری سمجھا ہے میرے لئے چیونٹیاں شاید کسی نصیحت کا باعث نہ بن سکیں۔ اس لئے کہ میرے سامنے کوئی ایسی دیوار ہی نہیں ہے جس پر چڑھنے کی کوشش یہ چیونٹیاں بار بار کریں اور بالآخر کامیاب ہو جائیں۔ میری نظروں کے آگے جو دیواریں کھڑی ہیں وہ تو یکجہاں ایسی ہیں جن پر یہ ننھی ننھی چیونٹیاں تو کیا دیو بیکر آدمی بھی نہیں چڑھ سکتا حالانکہ اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کر لیا ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ کے فتح ہو جانے اور چاند کے زمین بن کر آدمی کے پاؤں تلے آ جانے سے نہ اس کا چہرے کا کوئی تعلق ہے۔ جس نے

بچوں سے آم چھپٹ لیا ہے نہ اس غول سے کچھ واسطہ ہے جو میوزیپلٹ کے ڈبوں سے اپنے لئے غذا تھیا کرتا ہے، نہ اس کہانی سے کوئی ربط جس کی تلاش میں میں سرگرداں ہوں۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے انسانی برادری میں بھوٹ پڑ گئی ہے۔ جدھر سینگ سمائے تاغلے نکل پڑے ہیں۔ کوئی زمین کا سینہ چیر کر آپ ہی اپنی قبر میں اتر رہا ہے کوئی چاند پر کھنڈر پھینک کر رہا ہے۔

میں نے پاس ہی پڑا ہوا ایک ڈنٹھل اٹھالیا ہے اور دردی سے چمٹے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو الگ کر دیا ہے طحہ بھر کے بعد یہ منتشر چیونٹیاں پھر متحد ہو کر روٹی کے ٹکڑے پر ٹوٹ پڑی ہیں ان کے اس اتحاد سے بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں کوئی سبق حاصل کروں اس لئے کہ میں انسان ہوں۔ میں عظیم ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے لفظوں کے خطوط میں جن کے اس کج کی ایک تصویر مکمل کرنی ہے جہاں میں کہانی کی تلاش میں اپنی روزمرہ کی زندگی سے بھاگ کر چلا آیا تھا اس تصویر میں زندگی کے کچھ اور رنگ بھرنے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اُدھ کھڑا ہوتا ہوں۔ یہ سٹ آفس پہنچتا ہوں اور ایک ایڈیٹر کے نام اس کہانی کو پوسٹ کر دیتا ہوں۔ انھیں لکھتا ہوں۔

”معاذ ضروری بھجوا دیجئے مجھے شدید ضرورت ہے“۔ پھر۔ جملہ ڈاکھلتا ہے۔ میں اسے کاٹ دیتا ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر کچھ ہنسنے لے۔ یہ چھ سات بار صاف ذکر دیتا ہوں۔ لیکن کاٹنے اور بنانے کے اس عمل نے جو دھتے کا غلہ پراٹھا ہے میں کیا یہی اس کہانی کا اصلی روپ نہیں ہیں؟ کیا یہ کہانی مکمل نہیں ہے؟

گفتاری

اُف وہ آنکھیں کیسی آنکھیں تھیں۔ کھلی ہوئی ہونے۔ بے باوجود وہ کسی کو دیکھ نہیں رہی تھیں اور پھر انھیں دیکھنا بھی تو کس کے بس میں نہ تھا۔

اچھی بھلی ”نام“ اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ رات کے ایک بجے تک گپیں ہانکتی رہیں تھیں۔ سب سو گئے تو منو کو سٹانے کیلئے انھوں نے مینا کی وہ کہانی بھی سنائی جس کا گھر موم کا تھا جو بارش میں نمک کے گھر کی طرح نہ ڈھے سکتا تھا نہ بہہ سکتا تھا۔ اصرار ہوئی تو نام، بستر پر نمک کے گھر کی طرح ڈھے گئی تھیں۔

حلق سے خرخر کا آواز یہ نکلتی تھیں کہ بہت سی نواسی جو نانے بھر لو پر انگریزانی۔

نیند کے ٹوٹنے کا غم ہی کیا تھا کہ اسے خیال آیا۔

نانا اماں کو خبر کی مار کیلئے بھی تو اٹھانا ہے۔ اس نے جھنجھوڑا لیکن وہ تو خرخرانے میں بے سدھ تھیں۔

”ہاے میری توبہ!“ اُس نے اڑھنی کا خیال کئے بغیر ایک ہی چھلانگ میں تخت نیچے سونے والوں کو عبور کر لیا اور دھم سے سیدھی وہاں پہنچی جہاں مامی سو رہی تھیں۔

”مامی اُٹھیے۔ خدارا اُٹھیے نا نامم کیسا کر رہی ہیں“

ہڑبڑا کر مامی اُٹھیں تو نامم نے خرخرانا بند کر دیا تھا۔

درات کی جاگی میں نا جونا۔ سو رہی میں اچھی کھلی۔ تو بھی سو جا۔ جا بیٹا۔

نہیں مامی نہیں۔ ابھی ابھی وہ آوازیں نکال رہی تھیں۔ مجھے تو ڈر

مسا ہے۔

ہبتا ہبتا لہنگا اور ساری درست کر کے مامی اُٹھیں۔

یہ بڑے سے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ساری اور لہنگے کو گھٹا پھر

ما دو قدم چلنے کے قابل ہوئیں۔ پیٹ میں چھپا ہوا بچہ جاگ پڑنے کے خلاف تھا۔ سو رہو

رہو۔ تیند میں مزہ ہے جاگنے میں پریشانی۔ لیکن جونا مُصر تھی۔ ”مامی یقیناً نامم

مجھ سے ملے۔“

مامی نے نامم کو اتنا جھنجھوڑا کہ خود ہانپ ہانپ گئی۔ دوبارہ زیر ناف دونوں

ہاتھ دیکر پیٹ کو اس طرح سنبھالا جیسے فٹ سے بچہ باہر نکل آئے گا۔

”جا جونا بلالا اپنے ماما کو“ مامی نے ہار مان کر نامم کے لئے خطرے

اعلان کر ہی دیا۔

جونا بھاگی۔ بھاگتے وقت اسے خیال آیا۔

ماما ہوں تو آئیں بھی۔ وہ تو مسجد کے کسی گوشے میں مرا تبے میں

ہوں گے وہ پچھلے پاؤں لوٹ آئی۔

مامی! اما تو مسجد میں ہوں گے“

”آئی، تو کیا کوئی مسجد میں قدم نہیں دھر سکتا، کسی کو بھجوا دے، کھلوانا کہ بہت عبادت ہو چکی اب ایک دو قطرے پانی اپنی مال کے حلق میں بھی ڈال جائیں“

مامی کمر لہجے کا یہ انداز جو ناکے لئے نیا نہیں تھا۔ اور پھر ایسی صورت میں جبکہ بعد دن پہلے ہی مامی اور ماما میں گھمسان کا رنگ پڑا تھا، تو کیا مامی اپنی باتوں میں پھولوں کی خوشبو بھا کر بھیجتیں۔

ماما آئے۔ ڈاکٹر کیلئے بھاگم بھاگم ٹوٹے۔ ناٹم پر ایک بے سدھی چھائی ہوئی تھی سوکھی۔

ڈاکٹر نے اعسلاں کو دیا کہ فوراً داخلے میں رجوع کر دیا جائے گھر پر علاج ممکن نہیں۔

بہت دیر دھوپ کے بعد ایمبولنس دستیاب ہوئی اور ناٹم کو اسٹریچر پر ڈال کر ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ تاہم پر تار دیئے گئے۔ نزدیک و دور بیٹےوں کو اطلاع دی گئی کہ ناٹم کی حالت تشویشناک ہے۔ کوئی آج پہنچا کوئی کل پہنچا اور اس طرح آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

آنے والی بیٹیوں کے دل راستہ بھر ٹریلوں کی رفتارسے ساتھ دھڑکتے رہے کہ خدا جانے کیا منظر دکھائے۔ بیٹیوں اور نواسیوں کی آنکھیں جھرجھرتی رہیں۔ اماں کو بخش دیئے میرے مالک۔ ناٹم کو بخش دے میرے معبود اور پھر ناٹم کے بستر کے طرف چاہنے والوں کا میلہ سالگ گیا۔

واقعی ناٹم ہوش میں نہ تھے اور آج اتنے سارے جگر گوشوں کو اپنے گھر

جمع دیکھتیں تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کا مرض بغیر کسی علاج ہی کے دفع ہو جاتا لیکن نامم بے چاری تو ہر آنے والے سے بے نیاز تھیں۔

ڈاکٹروں نے سر جوڑ کر مرض کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہیمرج ہے، سہیریل تھر ہو سس ہے، کو طے ہے، ناج ہے، ہر حال اس خاندان کا کوئی ایسا مرض ہے جو ہوش و حواس پر مثل بن کر گر تا ہے۔

آنسوؤں اور دھڑکتے دلوں کے بیچ میں نامم چونکہ سب کو پیاری تھیں اسلئے ابھی تک اللہ کو پیاری ہونے سے بچی ہوئی تھیں۔ کوئی دقیقہ آل اولاد نے اٹھا نہ رکھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے دیکھا، ملاؤں پندلوں نے دیکھا۔ لیکن ہوش تھا کہ نہیں آتا تھا۔ ایک نہیں دو نہیں تین روز گزر گئے تھے۔

آخرش ڈاکٹروں نے یہ اتفاق آراء اظہار کیا کہ مزید تین چار دن یہ بیہوشی طاری رہ سکتی ہے اور اس دوران میں قوت جواب نہ دے اور عالم حالت اچھی ہے تو ہوش آجائے گا۔

نامم کو جیسے ڈاکٹروں کا یہ جھوٹ کھل گیا۔ رات ہی سے طبیعت اور بگڑی نبض کی رفتار اور دھیمی ہو گئی۔ دل دھڑکتے دھڑکتے بیچ میں صبح دے کر ٹھہر جانے کی کوشش کرتا۔ ناک میں تلکی داخل کر کے غذا تو پہلے ہی سے سرخ سے دی جا رہی تھی۔ اب ہاتھ امد بیر کی رگوں میں بربر کی ٹیوب سے ملی ہوئی سوئیاں داخل کر دی گئیں ہر ٹیوب کا دوسرا سرا بیا کے گھونسلوں کی طرح اُلٹے لٹکے ہوئے گلوکوز کے شیٹوں سے ملا ہوا تھا۔ اس پر بھی زندگی نامم سے بھاگ رہی تھی۔ سانس لینے میں انھیں بے حد تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نہ زبان سے کچھ کہہ سکتی تھیں نہ اشارے

کنائے ان کے بس میں تھے۔ ڈاکٹر اور متعلقین ان کی گرتی ہوئی حالت ہی سے سبب کچھ جان جاتے تھے۔ دوسری منتہی میں بھی ربر کی ٹنگی داخل کر کے آپ کیسجن چڑھائی جائے لگی۔ پیٹھ اور پسلیوں سے پانی اور رطوبت نکال کر امتحان کیا گیا۔ بہر حال ملک میں سائنس نے نے جتنی ترقی کی تھی اس کو ناظم نے کھلا جیلنج دے رکھا تھا۔ اور کس کی جیت ہوتی ہے یہ دیکھنے کیلئے انہوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔ ان آنکھوں کو کسی فرد سے کوئی تعلق جیسے نہ تھا۔ کسی ایک ہستی سے کوئی واسطہ جیسے نہ تھا۔ یہ آنکھیں تو ساری انسانی عقل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ اور لوگ کہہ رہے تھے، پاکستان کو تار دے دو، کینیا کو کیبل بھجوادو۔ منجھلے اور بڑے کی ہی تو یہ کھلی کھلی آنکھیں منظر ہیں۔ وہ آجائیں تو ان آنکھوں میں چمک آجائے گی۔

لیکن اس تماشے میں ناظم ہارنے لگیں۔ ڈاکٹروں نے رات بھر کوشش سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سائنس کی ترقی کو جیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

پبلک جھپکائے بغیر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے رکھنے والے متعلقین نے ایک دوسرے کو خوشی کے آنسوؤں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی مدھم نظر دل سے دیکھا۔ خدانے اماں کو بخش دیا۔ اللہ میاں نے ناظم کو ہمیں واپس لوٹا دیا۔

پھر آہستہ آہستہ ناظم کی نبض کی رفتار ٹھیک ہونے لگی۔ دل کی دھڑکن کی بے ترتیبی ختم ہونے لگی۔ سانس کی آمد و شد میں وہ اذیت نہ رہی اس طرح مزید چار دن اور گزر گئے۔ آپ کیسجن کی ٹنگی نکال دی گئی۔ ہاتھ اور پیر کی رگوں میں دھنسی ہوئی سوئیاں بھی یکے بعد دیگرے نہ رہیں۔ ناظم اب اطمینان سے سانس لے سکتی تھیں۔ ان کی آنکھیں اب کبھی کھلی ہوئی تھیں۔ سارکت سی بے نور سی۔ نہ کسی کو پہچانا اور نہ

اپنی ہی حالت کے سچا پنے میں کسی کی مدد کرنا۔ جدھر منہ پھیر دیا جاتا اُدھر کو یہ آنکھیں دیکھتی رہتیں۔ اور ان آنکھوں کی یہ جے تعلق تو دیکھی نہ جاتی تھی۔

دس دن ہو گئے لیکن نام کو ہوش نہ آیا۔ گولھوں اور بازوؤں پر الجھن لگتے رہے۔ ناک کی نلکی ہر دو سکو تیسرے روز کھولتے ہوئے پانی میں نہانے کے لئے باہر نکلتی رہی۔ پھر اس نے کبھی چوڑے اور بٹیر کے سوپکا مزہ چکھا۔ کبھی میوؤں کا رس غٹا لیا، کبھی حریرہ ہرپ کر گئی اور نام ہر ضیافت سے بے خبر سانس لیتی رہیں۔

نام کی آل اولاد کا رشتہ اب صرف ان کی چلتی ہوئی سانس سے ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنا آپا تاج کمرجن دو ایک چاہنے والوں نے نام کو موت کے منہ سے چھپٹ لیا تھا۔ انھوں نے جب اپنی سدھ بدھ لی تو زندگی نے انھیں چھپ چھپ کے اشارے کئے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ تیمار دار و تم خود ہی بیمار نظر آ رہے ہو تم پڑ جاؤ گے تو پھر نام کا کون کرے گا۔

جنھیں نام کے ساتھ ساتھ خود سے محبت تھی انھوں نے کچھ پہلے ہی جان لیا تھا کہ نام نہ کھل کر رو لینے دیتی ہیں نہ سکون کا سانس لے کر سونے دیتی ہیں خود لنگ رہی ہیں اور انھیں بھی معلق کر کے چھوڑ دیا ہے۔ سو ان لوگوں نے کچھ پہلے ہی نام کی بے نور آنکھوں سے سمجھو نہ کر لیا تھا۔ ان کی سانسوں ہی کو ان کی چلتی پھرتی زندگی مان لیا تھا اور خود معلق نہ لگنے کی بجائے زمین پر اپنے قدم دھر دیئے تھے۔

مہ کیا کروں اس لونڈیا کو بس دن رات بسورتی رہتی ہے۔ حد نہ میں بھی دو داخلے میں اماں کے قدموں سے لگی پڑی رہتی۔ آپ کتنی خوش نصیب ہیں آپا کہ دن رات ان کی خدمت کر رہی ہیں مجھ نصیبوں جلی کی ایسی سمت کہاں۔ اچھا

اب چلوں۔ شام جلد آجاؤں گی۔“

دس دن سے پندرہ دن ہوئے اور ناظم کو ہوش نہیں آیا۔ لیکن ناظم کی بے ہوشی کے ٹوٹنے کی امید میں جو لوگ گھر بار بھولے ہوئے تھے وہ اب آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگی۔ آپیم بے چاری قابل رحم تھیں۔ مشت استخوان۔ بارہ بچوں کی ماں۔ جنتے جنتے بے حال ہو گئی تھیں، خود ان کے میاں کا یہ حال تھا کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ ناظم کی بے ہوشی کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تو بچوں اور گھر بار کی یاد دہانے آہستہ آہستہ آپیم کو آگھیرا۔ بس تار پڑھا تھا اور اٹاری سے چیل پڑی تھیں سجد بھولی اور معصوم تھیں۔ بارہ بچے جن دیئے تھے اور اب سب کے سب انھیں عقل سکھاتے تھے۔ تار پڑھ کے سنایا گیا تو کہنے لگیں۔ ”ذرا ادھر بتانا تو۔“ بچوں نے جانتے ہوئے بھی کہ انھیں انگریزی نہیں آتی تار سامنے کر دیا۔

آپیم نے بغور دیکھا کہنے لگیں ”واقعی اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تار انھوں نے اپنے خط سے بھی نہیں لکھا۔ لکھنے پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوں گی جو اور دل سے لکھوا یا ہے۔“

بچوں نے ہنسی روک لی۔ دو چار شریر تھے جو بے ساختہ ہنس پڑے۔ آپیم نے ایسی نظروں سے انھیں دیکھا جو آنسوؤں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور بچوں نے پیشانی پر ہر خود کو بھی غمگین بنالیا۔

آپیم چلیں تو رکشہ میں آنسو نہ تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر اپنی حالت کو سمجھا لا ٹرین میں بیٹھ گئیں اور سب رخصت ہوئے اور ٹرین ریٹنگنے لگی تو آپیم نے پلو پھر آنکھوں پر رکھ لیا۔ لیکن کب تک؟ اٹاری سے حیدرآباد کا فاصلہ اتنا طویل

ہے کہ آنسو سوکھ گئے پر جی تھا کہ اٹھ اٹھ کر آتا تھا۔

آپم نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ پہنچتے کے پہنچتے انھیں اپنے
چھوٹوں سے گلے ملی کر پھوٹ پھوٹ کر رو لیتا ہے۔ بزرگوں کی تسلیاں سننی
میں اند صبر کی تلقین پر سعادتِ امندی سے سر ہلا لینا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر بھران کا
دل بھرتا۔

لیکن جب، دوا خانے پہنچی تو سب سے کہے۔ نہ کھل کر رو لینے کا موقع
تھا نہ رو دھو کر تین سے کسی گوشے میں بیٹھ رہنے کا۔ لوگ گونگے بہرے سایوں
کی طرح چل پھر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ رات آنکھوں آنکھوں
میں کٹتی تھی۔ آپم نے یہ نقشہ دیکھا تو خود بھی سہم گئیں۔ لمبے سفر کی تھکان جو آپم کے
ساتھ تھی اسے دور کرنے کے لئے فرش پر ٹانگیں پساد کر بیٹھ گئیں اور حسرت سے اماں
کو تکتی رہیں پھر سوکھے پانوں کا بیڑا بنا کر جبرے میں ڈالیا۔ پھر چٹکی بھر زردہ
پھاٹک کر پیک کو اس طرح منہ میں گھلایا جیسے رس گلا کھا رہی ہوں۔ پھر لمبی
ٹھنڈی سانس لی اور بیٹھ رہیں۔

منجھلی بہن ماں کی تیار داری میں جٹی ہوئی تھیں۔ دن رات اس نے ایک
کر دیا تھا۔ گھر بار اور بچوں کی سمدھ نہ تھی۔ ہاسپٹل سے دو میل پر گھر تھا لیکن
انہوں نے دو ہفتوں سے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھا۔ نام کا سارا
کام اپنے ہی ہاتھوں کرتیں۔ ناک کی نلکی سے سرخ بھر کر غذا پہنچاتا۔ بد سوس
سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً نام کے بدن کی صفائی کرنا۔ دوائیاں پلانا غرضیکہ
اچھی خاصی تربیت یافتہ نہیں بن گئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے بھی ان کی نرسنگ کو سراہا

تو منجھلی کی اہمیت خاندان کے آنے جلنے والے افراد میں مسلم ہو گئی۔ ملنار تھیں، بچہ خلیق، لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے ایسا پہنا پید کر لیا کہ ہاسپٹل بھر میں ڈاکٹر سمجھی جانے لگیں۔ لوگوں کی غلط فہمی پر یہ خوش فہمی کا شکار ہو گئیں۔ اپنے تئیں خود کو ڈاکٹر ہی سمجھ بیٹھیں اور اس انانے اتنا غلو کیا کہ وہ سوائے اپنے کسی بہن یا بہو کو نام کی تیمارداری کا اہل ہی نہیں سمجھتی تھیں۔

بہنوں، بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں میں جو زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے تھے انھوں نے منجھلی کی مزاج داری ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اور جاں بوجھ کر منجھلی کو بلندنہیوں میں اچھالا تا کہ خود کو آہستہ سے کھکنے کا موقع ملے۔

جو ذرا کم فہم اور زود در نہ تھیں انھوں نے منجھلی کے اس طرح خود کو اہمیت دے لینے پر پہلے پہلے بُرا مانا۔ لیکن جب حواس درست ہوئے اور نام کی طویل بے ہوشی کے امکانات کا علم ہوا تو قسمیں کھا کھا کر منجھلی کو بتایا کہ ”منجو باجی ذرا آپ ہی سوچئے آپ کے کئے سے انکار کرنے والا کافر۔ یہ سب ایسوں کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں جو ایسے وقت بھی ہماری محبتیں اور رفاقتیں نہیں دیکھ سکتے۔ اور کیا آپ اپنا تن من لگانہ دیتیں تو اماں بی ہمیں واپس بل سکتیں؟ پہلے اللہ اور اس کا رسول ہے اس کے بعد آپ اور کھائی میاں ہی تو ہیں جنھیں اپنی سُدھ بدھ بھی نہیں ہے۔ کیا ہماری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ کیا ہمارے ایمان خر گئے ہیں۔“

اور منجھلی آیا آنسو پونچھ کر مورچے پر ڈٹ گئیں۔

اور جونہی کے امام محلہ کی مسجد سے اپنے معتقدین کے ہاسپٹل ہی کے ایک گوشے میں اکھڑ آئے۔

بیس دن ہونے کو آئے لیکن ناغم تھیں کہ آتی جاتی سانسوں کی
 دور تھامے اپنے کھلے دیدوں سے زندگی کا اعلان برابر کر رہی تھیں۔
 ڈاکٹر دول نے اب آہستہ آہستہ کھنا شروع کیا۔

ایسے مریض دو مہینے بھی اسی حال میں رہ سکتے ہیں دو سال بھی اور اس
 سے زیادہ بھی اور ابھی تو صرف بیس دن ہوئے تھے۔

ناغم ایمبولنس میں جب پہلے پہل دواخانہ میں لائی گئی تھیں تو دوسرے
 دن ہی خبر پائی کہ خاندان کا خاندان ٹوٹ پڑا تھا۔ ملنے کے اوقات کی ابھی گھنٹی بجی
 نہیں بجتی تھی کہ لوگ جوق درجوق آنا شروع ہوتے۔ سارا کمرہ بھر جاتا۔ یہاں تک
 کہ واردہ میں بھی ناغم کے لوگ نظر آتے۔ دوسری گھنٹی ملنے کے اوقات کے اختتام
 کا اعلان کرتی تب بھی بجائے اس کے کہ آئے ہوئے لوگ واپس جاتے۔ نئے لوگ
 آتے رہتے لیکن ان بیس دنوں میں کیا پلٹ گئی تھی۔

دو روز، چار روز، چھ روز، دس روز آنے والے اپنے اخلاص کے پہلے
 اپنے اپنے دلوں میں چھپائے آتے رہے۔ لیکن بیس دن تک اخلاص کا مظاہرہ کرنے
 کے لئے کوئی پیمانہ ہی نہ بنا تھا تو بیچائے لوگ کیا کرتے۔ اب پہلی گھنٹی بجنے کے
 دوسری گھنٹی ناغم کے کمرے کی خاموش فضا میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ بس دو چار چہرے
 اپنی اپنی مجبوریوں کو محبت کا نام دے کر ہاسپٹل کا طواف کیا کرتے۔ ان طواف
 کرنے والوں میں ایک تو منجھلی آپا کے باڈے باڈے سے شوہر تھے۔ دنیا کی ہر بات
 میں پہلے انسانیت کی بوتلاش کرتے تھے۔ پھر سب کچھ لیکن اس انسانیت کی
 نوکے تعاقب میں اتنی دور نکل جاتے کہ ہاں پہننے لگتے اور آخر میں گھٹنے جنگل میں ایسے

شکاری کی طرح اکیلے رہ جاتے جسے نہ شکار ملا نہ لوٹنے کا راستہ۔

ان بے چاروں کی مجبوری یہ تھی کہ منجھلی آپا ان کی کمزوری تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ جان گئے تھے کہ منجھلی آپا نے انھیں کبھی محبت نہ دی لیکن پیار تو پاگل پی کا دوسرا نام ہے کہیں سے کچھ ملے نہ ملے۔ قیس کے مقلد میں نہ لیلیٰ تھی نہ ناتہ لیلیٰ۔ صرف وحشت کی وسعتیں تھیں سو اس نے وناؤں کا بول بالا کر دیا۔ یہاں تو اچھی بھلی منجھلی آپا ان کی معشوقہ تھیں وہ کبھی کیسی جو بیوی ہو۔ جب چاہا ہاتھ لگالیا۔ جب چاہا ہاتھ پھو کر دیکھ لیا۔ کیا یہ نعمتیں کم ہیں۔ اب یہ کیا ضروری تھا کہ منجھلی آپا انھیں چاہیں بھی۔ سو یہ بے چارے منجھلی آپا کے پیچھے پیچھے پھر کرتے۔ ایک طرف محبت کی لاش اپنے سینے میں چھپاتے۔

منجھلی آپا بھی نہ نلے کی عورت ہیں۔ جو انکھیں کچھائے اس کے دیدے پیروں تلے مسل دیتی ہیں۔ جو نظر بھی نہ اٹھائے اس کے آگے کچھ جاتے ہیں۔ ان کے باؤں نے شوہر نہ یہ تہیں جانتے تھے نہ جانتا تھا تھے تو صرف اتنا جانتے تھے کہ انسانیت کے ناطے اپنا دل اتنا وسیع کر لو کہ ان جیسے سارے پاگل اس میں سما جائیں۔

اب ان بے چاروں کا امتحان تھا۔ محبت کے ہر امتحان میں بدھو کی طرح سر جھکا کر وہ کامیاب اتر گئے لیکن اس امتحان کی کوئی مدت ہی نہ تھی بس آزمائشیں تھیں اور ان سے گزرتا تھا۔

نام کی دوسری بیٹیاں اور بہوئیں اپنے اپنے شوہروں سے گھس پھس باتیں کرتیں۔ جیسے جیسے نام کی بے ہوشی کا سلسلہ لمبا ہوتا جاتا۔ بیویوں اور میاؤں۔ کچے سر قریب ہوتے جاتے۔ صرف منجھلی آپا تھیں کہ دوا خانہ میں اصلی لیڈی ڈاکٹر کی طرح نام کی خدمت میں جتنی ہوئی تھیں اور ان کے شوہر میل نرس کی طرح آگے

بیچھے پھرتے تھے جن سے منجھلی آپا گھڑک گھڑک کر لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے بات کرتیں لیکن وہ تھے کہ برابر دوا خانے کا طواف کرتے کیونکہ میل ٹرس ہونے کے ناطے یہ ان کا فرض تھا۔

ڈر ہے کہ آپ ان بے چاروں کو سچا سچ کامیل ٹرس نہ سمجھ بیٹھیں وہ تو منجھلی آپا کی نقلی ڈاکٹری کے ناطے مارے پڑے اس عہدہ پر فائز کئے گئے تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ منجھلی آپا کی صحت کا خیال رکھیں۔ اب تو منجھلی آپا جنرل کمزوری کا شکار بھی تھیں اور اپنی ماں کی وجہ سے فکر مند بھی۔ اس پر متزاد دن رات کی خدمت اور تیمارداری ان باتوں سے ان کے شوہر بڑھکھلا گئے تھے۔ صرف ان کے ہونٹوں کی لپ اسٹک آنکھ کا کاجل اور بالوں کا خضاب ہی اس بات کا ضامن تھا کہ انھیں اپنی بھی کچھ خبر ہے۔

منجھلی نے دودھ پیا، تم نے خود کو انجکشن لگوایا، تم نے ذرا کی ذرا کمزوریدھی کی ہوئی۔ تم پچھلی رات سو بھی سکی ہو۔ تم لوگ باری باری سے اپنی ڈیوٹی کیوں نہیں کر لیتے۔ تم اکیلی کہاں تک نپٹو گی ذرا اپنا بھی تو خیال کرو۔ لیکن منجھلی آپا لپ اسٹک درست کرتی ہوئی ایک ہی گھڑکی میں انھیں سمجھا دیتیں کہ خاندان کی کوئی عورت میرے سے اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ اماں کی تیمارداری کر سکے۔ ناک کی نلکی سے غذا اپنچانا۔ بد سول سے بچانے کیلئے بدن کی صفائی کرنا۔ یہ سب ایسے ہنر ہیں کہ بڑی بڑی ٹرسیں نہیں کر سکتیں پھر یہ لوگ جو ڈاکٹروں سے ڈھنگ کی بات بات بھی نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ کیسے کر لیں گے۔ اور بے چلے منجھلی آپا کے شوہر بے بسی کا مجسمہ بن کر میل ٹرس بن جاتے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے لوگ کنارہ کش ہوتے گئے۔

اب تو بات دلوں کے بس سے نکل کر مہینوں کے اختیار سے بھی آگے جا رہی تھی۔ جو نا جو ایک ایک کا منہ تکتی رہتی تھی اب دوا خطنے ہی میں رہنے لگی تھی اور منجھلی آپا نے آہستہ آہستہ اسے ٹریننگ دینی شروع کر دی تھی۔ منجھلی آپا اصلی ڈاکٹر تھیں تو وہ بھی کسی مکمل نرس سے کم نہ تھی اور پھر منجھلی آپا کا گھر بار بھی تھا۔ بچے بھی تھے۔ میاں میل نرس کی طرح آگے پیچھے کوئی نہ پھر میں گھر تو کبھی یاد آئے گا ہی۔ کیا ڈاکٹروں کے گھر بار بچے نہیں ہوتے۔ اور پھر وقت کھاتے بیسے فاصلے بھی ناظم کی وحشی آنکھوں کو آئینہ نہ دکھا سکیں گے اس کا علم کس کو تھا۔ سو اب منجھلی آپا بھی خدا خدا کر کے اپنے گھر بار میں دلچسپی لینے لگیں۔

جوتالیوں بھی ناظم کی جان تھی۔ ماں باپ ہمیں رہیں مراد آباد میں ہوں کہ اٹاری میں وہ تو ناظم کے ساتھ بستی بستی پھرتی۔ نگر نگر کا چکر کاٹتی۔ ناظم نے اس کو بے حد چاہا اتنا کہ ناظم کا تصور اس سے ہٹ کر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جوتالی پر نظر پڑتی تو بچے پکار اٹھتے ”ناظم ناظم آ گئی، ناظم آ گئی“۔ اور اپٹر پٹر سلیمپر گھسیٹی ناظم نظر آئیں تو جوتا کی بھجولیاں پکارتیں ”جونا دیدی، جونا دیدی“۔

کہتے ہیں ناکہ اصل سے بیجا، پیارا، سو جوتا ناظم کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیاری تھی۔ سچ پوچھیے تو ناظم کو جوتا ہی مرنے نہیں دیتی تھیں۔ ناظم زندہ تھیں تو صرف اس لئے کہ جوتا کو دلہن بنا کر دیکھ لیں۔ بہرہ کے پھول کھلتے دیر نہیں لگتی لیکن بہرہ گندھ جائے تب نا۔ یہاں یہ عالم تھا کہ ناظم اور جونا ہندوستان میں اور بہرہ گوئدھنے والے ہاتھ کٹ کر پاکستان اور کینیا کدھر کدھر بکھر گئے تھے۔

اب یہ ہاتھ رول بٹور کر دولت لاتے تب ہی جونا کا سہرہ گندہ پاتا۔ سونا نام میں اسی انتظار میں گھر کی دہلیز بن کر رہ گئی تھیں اور اب وہ آنکھیں جو پاکستان کی دنیا سے آنے والے جونا کے سہرے کا دہلیز پر انتظار کرتی رہی تھیں۔ چپکے سے دواخانہ اٹھ آئی تھیں۔ اندر یہاں آکر ان آنکھوں نے پلنگ جھپٹکا نامک بھلا دیا تھا۔

جونا تھی کہ سوبار دھڑپہ گرا کر سنبھال لیتی۔ پیر زمین پر پڑتے ہی نہ تھے۔ چلتی تو یوں لگتا جیسے چلا سیکھ رہی ہو۔ کھیلنے کو دنے کے دن، جمایاں اور انگریزیاں لینے کی شاہیں اور ٹوٹ ٹوٹ کر سونے کی راتیں۔ جونا اپنی عمر کا یہ اناٹہ نام کی وحشی آنکھوں کے ساتھ دواخانہ اٹھا لائی۔ نام جب دیکھ سکتی تھیں تب بھی مٹ مٹ جونا کو دیکھ جاتیں۔ اس کی پتھر ملی جوانی اب ان کے سینے پر سپاڑ بن گئی تھی۔ اور پھر اس پہاڑ کو چھاتی پر سے سرکانے والے ہاتھ تھے پاکستان اور کینیا میں جونا آتے تھے اور نہ یہ بوجھ اترتا تھا۔ اب اس بوجھ کے نیچے نام ایسا دیں کہ گنگ ہو گئیں اور آنکھیں پتھر اگئیں ان کی۔ جونا کو آنکھوں میں بسایا تو نام نے ایسا بسایا کہ آنکھیں کھلی رکھ کر بھی اس کے سوا کسی کو نہ دیکھنے کی انھوں نے قسم کھالی۔ اب تو دواخانے میں نام کے پاس اکیلی جونا رہ گئی تھی۔ نام اسے اس طرح گھورتی رہتیں کہ وہ ڈاکو کی موجودگی میں سو سو بار ڈھلکنے والے آچل کو ہزار ہزار بار سنبھال لیتی۔ نام کی آنکھیں اپنی جگہ ان کے چہرے پر بے ستور موجود تھیں لیکن ان آنکھوں کی بصارت جونا کے بدن کے ہر سام میں گھس کر چھپ گئی تھی۔ جونا کیا چلتی تھی۔ نام کی آنکھیں چلتی تھیں۔ ان کی بصارت چلتی تھی۔ اور جونا کو کبھی کبھی نام کی ان آنکھوں سے وحشت ہوتی۔ اور جب سے وہ آنے لگا تھا جونا کو نام کی آنکھیں زیادہ ہی وحشت زدہ

لگی تھیں۔ جیسے ناہم جان گئی ہوں کہ جو تلنے پھر دل مار دیا ہے۔ یہی فکر تو بس ناہم کو کھائے جاتی تھی کہ دل مارنے والی ان کی ننھی مٹنی بخونا کہ میں کس کے آگے اپنا آپا ہی مارے تو یہی سوچ سوچ کر ناہم کی آنکھیں پھیل پھیل جاتیں اور جونا کا پتی پتی اٹکی کھلی پر دکر نظروں کے تاروں سے سہرہ گندھنے لگتا۔ اور یہ سہرہ اتنی بار ٹوٹا کہ اب تو ناہم کی نظروں کے تار ہی الجھ گئے تھے۔

جونا جانتی تھی کہ ناہم بے بس ہو گئی ہیں ورنہ اس بار بھی اس کا گمشدہ دل اپنی راتوں کی نیند نہ کر دے کسی نہ کسی طرح تلاش کر لائیں اور جونا کے کیسے بڑی احتیاط سے رکھ دیتیں اور پھر سینے پر کان رکھ کر اس کی ٹپک ٹپک بغیر مٹتیں جب انھیں محسوس ہوتا کہ سب کچھ برابر ہے اور جونا کے دل کا کوئی ٹکڑا کہیں رہ نہیں گیا ہے تو پھر وہ قلمدان کھول کر کاغذ اور قلم سنبھال لیتیں۔ ادھر پین سے روشنائی کا غدنگ پہنچتی ادھر ناہم کی آنکھیں روشنائی پر برس کر کاغذ پر آنسوؤں کے پھول بننے لگتیں۔ ناہم جب تک رو سکتی تھیں کسی نے کاغذ پر نہ بکھرے ہوئے ان پھولوں ہی کا سہرہ گوندھ لیا ہوتا۔ لیکن ان پھولوں کو پہچاننے کی کوئی زحمت بھی تو نہ کرتا۔ تھم تھم کر سنبھل سنبھل کر کاغذ کو بچا کر آنسوؤں کو پلو میں چھپ کر ناہم جب جی کا لوجھ ہلکا کر لیتیں تو پھر یہ خط سوجن سے پاکستان اور کینیا پوسٹ کر دیئے جاتے۔ لکھنے سے لیکر بند کرنے تک بند کرنے کے بعد پوسٹ کرنے تک ناہم سارا کام خود ہی کرتیں۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پاکستان اور کینیا تک خطوط کے ساتھ ہینچکر اپنے بیٹوں کے ہاتھوں میں خود ہی خطوط رکھ آتیں اور لوٹ کر ایسی زخمی نظروں سے خاندان بھر کو دیکھا ہوتا کہ ہر ماں اپنی بیٹی کی

ہندی لگانا بھول جاتی۔ لیکن بُرا ہوا اس بیماری کا کہ نانم سے اس نے ہندوستان
 پاکستان کینیا بھی کچھ چھین لیا امدان کی آنکھوں کو دو سسکی جہاں کے اجنبی راستوں
 پر بھٹکتا چھوڑ دیا۔ جہاں حق و دق صحرائیں لپکتے شعلوں کی زبانیں تھیں اور باغوں
 میں دودھ اور شہد کی نہریں بھی لیکن نانم بضد تھیں کہ وہ ان راستوں پر نہیں چلیں گی،
 امدان کی آنکھوں میں ابھی تک پاکستان اور کینیا ہی کے راستے بسے ہوئے تھے
 جن پر جو ناکا ہاتھ پکڑے وہ ایڑ پیڑ خود کو گھسیٹ رہی تھیں اور اس طرح نانم
 نے اپنے مرض الموت سے چھ جینے گزرنے پر بھی ہار نہیں مانی۔ اور نانم ہار
 مان بھی نہیں سکتی تھیں اس لئے کہ اب وہ قریناً روز ہی دوا خانے کے لگا تھا۔
 اور نانم نے جو ناکے جس سہرے کے لئے پاکستان اور کینیا کی طرف نظریں بچھا رکھیں
 تھیں اسی سہرے کو اس روزانہ آنے والے نوجوان نے راستے ہی سے جیسے جھپٹ
 لیا تھا اور نانم کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہر لہرا کر انھیں بتانے لگا کہ
 وہ دیکھو جو ناکا سہرہ میرے ہاتھ میں ہے کہو تو ڈال دوں اس کے گلے میں۔
 دلیکین نانم تھیں کہ انکار کئے جا رہی تھیں۔ یوں سمجھئے کہ اب نانم کی وحشت زدہ
 آنکھوں کے اندر آنے کا دو سرا باب شروع ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں جو جونا کے
 لئے زندہ تھیں وہ آنکھیں جو جونا کے سہرے کی تلاش میں دوا خانے تک چلی
 آئی تھیں۔ وہ آنکھیں جو نوجوان کے ہاتھ میں جونا کا سہرہ دیکھ کر موت پر آخری بار
 فتح پانے کی آخری کوشش میں کھلی تھیں۔

پھر روز ہی آنے والے لوگوں نے جواب بھولے سے کبھی کبھار آجاتے
 تھے اپنے کانوں سے سنا کہ وہ بلا ناغہ صبح صبح دوا خانہ آجاتا ہے اور راست کو

لوٹتا ہے اور کیا پتہ کہ رات کو بھی لوٹا ہے کہ نہیں۔

رات کو بھی لوٹا ہے کہ نہیں۔ کیا کہا؟ کیا کہتے ہو؟

رات کو بھی لوٹتا ہے کہ نہیں۔ اوئی خدا کی مار۔

خاندان بھر کے کان ہر روز دے اپنے ہی ہاتھوں سے بیٹھ کر دس گھنٹوں

کے چوروں کی طرح بنائے اور ہر کان میں امرت دس یوں ٹپکنے لگا جیسے لفظ

لفظ نہیں ہوند ہوند ہو۔

دن کو بھی سر جوڑ کر بیٹھ رہتے ہیں دونوں۔

اور نام مٹ مٹ نکا کرتی ہیں گویا دونوں سے سمجھوتہ کر رہی ہوں۔

جو نام اس کے سینے سے لگ جاتی ہے تو وہ نام کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہتا ہے۔ مٹھو بیٹے پتی دو۔

اور نام کی آنکھیں بنجرے سے چھوٹے ہوئے طوطے کی طرح ادھر

ادھر دیکھتی ہیں پھر یہ نظریں چاہتی ہیں کہ اپنے جسم کو چھوڑ کر اپنی بیسائی کو

ایک جا سمیٹ کر پھر سے پاکستان اور کینیا کی طرف اڑ جائے۔

لیکن جب وہ نوجوان کہتا ہے مٹھو بیٹے پتی دو پتی دو۔ تو جونا کہتی ہے

دیکھو نام مکراد ہی ہیں اور جونا ایسے میں اپنا ڈھلکا ہوا پلو بھی برابر نہیں

کرتی۔ منجھلی آپا نے جب گھس پی سنی۔ لفظوں کا امرت جب بوند بوند بن کر اُن

کے کانوں میں بھی ٹپکا تو انھوں نے وقت بدل بدل کر دروازے کے چکر کاٹنے

کی ٹھانی کہ موارنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ منجھلی آپا لیڈی ڈاکٹر تو تھیں

ہی صرف اسٹیتھس کوپ گلے میں نہ تھا لیکن جب چاہا دوا خانے جاسکتی تھیں

بالکل چھپیں لیا جو کبھی اس کے حصے میں آتا تھا اور جس کا انکشاف وہ کسی کے سامنے بھی کر نہیں سکتی تھی لیکن اب تو جونا کا جی چاہتا تھا کہ نانم برسہا برس یونہی پڑی رہیں۔ اور ان کی تیمارداری کا سلسلہ اتنا لمبیل ہو جائے کہ جونا بس ان کی خدمت ہی میں لگی دن رات ایک کر دے۔

اور جس ہی سے جونا کی نظریں اسی راستے سے لگ جائیں جدھر سے وہ آئے والا ہوتا۔

نانم نے مجھ پر لاپوسا۔ یہی ناکہ سینہ چوکر دودھ نہیں پلایا، سینے سے لگا کر تو رکھا۔ بھلا ان کی خدمت اب میں نہیں تو کون کرے گا۔

اور جونا نے نانم کی خدمت گزاری ہی میں اپنی پروان چڑھتی ہوئی نئی محبتوں کی لذتیں اور نعمتیں کچھ ایسی صفائی سے چھپا لیں کہ خاندان کا کوئی ترم خال بھی انگلی اٹھانے کی جرات نہ کر سکا۔

جونا کا موقف بہت مضبوط تھا۔ اس کی محبت کی چغلی کھانے والے سزا۔ اس کو نانم کے مورچے سے ہٹاتے تو دوسرا فریضہ یہ بھی تو ادا کرنا ہوتا کہ جونا کی جگہ پر کرنے کے لئے نانم کی خدمت میں جھٹ جلتے۔ کون مائی کا لال ایسا تھا جو اس سانس لیتی ہوئی لاش کو نگے کا ہار بناتا۔ سب کے گھر بار تھے۔ سب کی اپنی اپنی اچھی بڑی زندگیاں۔ اور نانم کی آنکھیں تھیں کہ پتھر بن کر بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہی آنکھیں جو پاکستان اور کینیا سے جونا کیلئے پھولوں کے ہاروں کے انتظار میں اب خود ہی اس کے اور اس کے چہرے نے جونا کے گلے کا ہار ہو گئی تھیں۔

نانم اب سچا پوچھو تو ایسی گھڑی تھیں جس میں جونا نے اپنے لئے پرانے رومانی

چھپا رکھے تھے اور نام نے اپنی دھجی دھجی ہستی کو بھی شاید اسی لئے بکھرے نہ دیا کہ کہیں
 جونا کے یہ ڈھکے چھپے رومانس کسی کو نظر نہ آجائیں۔ اور اب اس گٹھری کو اٹھائے
 پھرنا کسی کے بس کا روگ بھی نہ تھا اور یہ یوں بھی اچھا ہوا کہ جونا کے رازوں کی پورٹ
 جونا ہی کے تصرف میں رہی۔ وہ بڑے جتن سے اپنی نئی محبت کی نعمتیں نام جیسے بوسیدہ
 گٹھری میں چھپاتی رہی۔ جس کو کھولنے میں اب کسی کو دلچسپی ہی نہ تھی۔

جہاں اس گٹھری میں جونا کی چھوٹی بڑی محبتوں کے دنیئے چھپے تھے وہیں
 وہ محرومیاں بھی چھپی تھیں جو پاکستان اور کینیا سے پھولوں کے گجروں کے انتظار میں
 نام کو ملی تھیں۔

آخر شش ہوا یہ کہ نام کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں کھوئی ہوئی نظروں نے
 ان اجنبی راستوں میں خود کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جو ایکلے شعلوں اور شہد کی ہنروں کی
 طرف کہیں جاتے تھے۔ ادب یہ بھی عجیب بات ہے کہ نام نے موت سے ہار مانی تو زندگی
 پر رنج پا کر مانی۔ جس شام جونا اپنی ایک ہسپلی کو نام کے پاس بٹھا کر جونا کے ساتھ
 چلی گئی تو نام نے آنکھیں جھپکانے کی آخری کوشش یوں کی کہ اس کے بعد آرام سے سولیں
 گی۔ ادب جب جونا صبح ہوتے ہوتے لوٹ آئی تو اس کی ہسپلی نے بڑے چاؤ سے جونا
 سے سب کچھ پوچھا۔ جونا نے شرم و حیا کا پیکر بن کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بات
 آگے بڑھی۔

”صرف قاضی صاحب تھے اور ان کے دو دوست گواہ کے طور پر تھے اور۔۔۔
 تیرا عاشق زار و کیل بنا تھا۔“ جونا نے ہسپلی کی ران میں چٹکی بھر کر اس طرح کہا جیسے
 رات کی لذتوں کا بکاسی مزہ کچھ رہی ہو۔

اور پہلی نے مبارکباد دی۔ گلے سے لگایا، پیشانی چومی، کمال چومے پھر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ امد جونانے شرما کر دوپٹہ برابر کر لیا۔

اور جب جونانام کی طرف ”مٹھو بیٹے پی“ دو“ کہہ کر رجوع ہوئی تو۔ ”مٹھو بیٹا“ اس بوسیدہ قفس کو چھوڑ کر اجنبی فضاؤں میں پرواز کیلئے اپنے بے جان بازوؤں کو سمیٹ سمیٹ کر پھیلانے کی سعی کر رہا تھا اور آنکھیں تھیں کہ جونانام کو اس طرح ہلکے جا رہی تھیں جیسے سب کچھ جان گئی ہوں۔ ان آنکھوں میں نہ مروت تھی نہ سفاکی نہ محبت تھی نہ نفرت نہ امید کی کرن تھی نہ محرومی کا سایہ۔ کچھ بھی تو نہ تھا، کچھ بھی تو نہ تھا۔ لیکن ان سارے جذلوں کی میت اٹھائے ہوئے ایک ایسا دروازہ آنکھوں میں تھا جسے دیکھا نہیں سوچا جاسکتا ہے۔

اور جب دوا خانے سے گھر منتقل کی جانے کے بعد نام کی میت اٹھی تو سارا خاندان پھر جمع ہو گیا تھا۔ منجھلی آپا کی حالت غیر تھی اور لپ اسٹک اب ان کے ہونٹوں پر نہ تھی۔ ان کے شوہر جانی پہچانی خواتین سے منت سماجت کر رہے تھے کہ وہ منجھلی کو سنبھالیں۔ ایک پٹس تھی ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اس کے غم کی طرف دوسرا توجہ کرے۔ ماما کے معتقدین کا ابنوہ کثیر باہر جمع تھا اور ماما زلفیض نوچ نوچ کر آیتیں پڑھتے جلاتے اور بیچہ بیچہ میں یک لخت خاموش ہو جاتے تھے۔

امد جونانام کسی اکیلے گوشے میں کسی چوڑے چکلی سینے پر سر لٹکھ نام کی رفائیتیں یاد کر کر کے تڑپ رہی تھی۔

نام دنیا سے یوں اٹھیں جیسے رازوں سے ٹھنسی ایسی گھڑی ہوں جسے لوگوں نے میت کا نام دے کر آخری بار بھی کچھ چھپانے کی کوشش کی ہو۔ اور وہ نام جنھیں سروں پر اٹھنا تھا کندھوں پر پیل پڑیں۔

جہاں میں ہوں

حمد و نجا کا بھاگا آیا اور اس کمرے تک چلا آیا جس کو نئے دو بہاد لہن
 نے ابھی تک بند کر رکھا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک
 آدھ پیٹ بھی کھلا ہوتا تو وہ شاید ڈراتا ہوا گھس جاتا لیکن جب آہستہ سے دروازے
 کو دھکا دے کر اس نے دیکھا تو دروازہ اندر سے اچھی طرح بند تھا اور حمد کے سوا
 صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ مگر بہت بے چین تھا۔ بہت مضطرب اس لئے کہ جو خبر
 وہ سنانا چاہتا تھا وہ نہ صرف بہت اہم تھی بلکہ اس کی اپنی دانست میں ایک لمحہ کی تاخیر
 کے بغیر اس خبر کو سائے محلہ میں پھیل جانا چاہیے تھا اس نے رٹ پ کر دروازے کی
 طرف دیکھا۔ یہ بات تو جانتا تھا کہ در بہاد لہن نئے ہوں تو دروازے ویر تک بند
 رہتے ہیں۔ کھٹ کھٹا کر غل ہونے سے وہ ڈرتا تھا۔ لہذا اپنی بھٹی ہوئی نکر کو برابر
 کرتے ہوئے وہ برآمدے سے نکل کر دالان تک پہنچا کہ شبیر چچی کو ہی سب بتا دے

لیکن وہ تو مسئلہ بچھائے پلو سے سر ڈھکے ادائی نماز کے بعد اپنے سر کو ایسی زور زور سے جنبش دیکر کوئی وظیفہ کا ورد کر رہی تھیں کہ دالان میں صرف ان کے منہ مانے کی آواز کے ساتھ ساتھ سر کو جنبش دیتے وقت جو ایک خاص قسم کی خرسی نکلتی تھی بس وہی سنائی دیتی تھی۔

حمود کے لئے اب زیادہ انتظار کرنا مشکل تھا۔ اس فرض کی ادائی اس نے اپنے ذمہ لے لی تھی کہ سارے پڑوسیوں کے کانوں تک اس اہم ترین خبر کو اپنی غلیل کے کنکر سے زیادہ سرعت کے ساتھ پہنچا دے گا۔ جو درخت پر بیٹھی ہوئی پھر یاموں تک بلک بھپکنے میں پہنچ جاتا ہے۔

حمود نے سوچا ہو گا کہ اس گھر میں تو کوئی کمرے میں بند ہے۔ کوئی خول میں۔۔۔ کمرے کا دروازہ تو مضبوط تھا جو کھل نہ سکتا تھا۔ حمود نے وظیفہ پڑھتی ہوئی شبیر چچی ہی کو خول سے باہر کھینچ لانا مناسب سمجھا اور آگے بڑھ کر جانماز ہی پر اٹھیں جا لیا اور کان کے قریب جا کر کہا، ”چچی قرتی آئی ہے“ صفتی ہو چچی قرتی آئی ہے۔“

اب اور زیادہ وقت حمود ضائع نہ کر سکتا تھا۔ اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ شبیر چچی نے وظیفہ کی خرخر بھی آنکھیں بند رکھ کر جاری رکھی ہے اور بات بھی سن لی ہے۔ چنانچہ وہ پلٹا اور اپنی نکر برابر کی اور بگسٹ بھاگتا حاجی اسد اللہ کے دروازہ پر جا پہنچا۔

حاجی اسد اللہ صبح کی پہلی بیڑی جلاتا ہوا اس کو دروازہ پر ہی

مل گیا۔

”سنا حاجی نانا“ حمدو نے بڑی سنجیدگی سے کہنا چاہا
 ”پہلے سنا تو مردود۔ سنا تا تو کچھ نہیں ہے۔ کہے جاتا ہے سنا ہے
 سنا ہے“

”نانا قرتی آئی ہے قرتی“

حمدو نے اس طرح تن کر کہا جیسے رعب بتا رہا ہو۔

”تو آنے دے قرتی کے بار۔ رکھلے اپنے گھر جو ابنا کر۔ لیکن حاجی
 اسد اللہ کو جب بات کی اصلیت سمجھ میں آئی تو وہ چونکا۔ کیا کہہا قرتی آئی ہے؟
 لیکن حمدو تو چھٹی ہوئی نگر پر ہاتھ دھرے اپنے چوڑے چھپاتا بھاگ رہا تھا اور جب
 حاجی اسد اللہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ روپ متی کے دروازہ پر کھڑا اطمینان
 سے دروازہ کھٹ کھٹا کر رہا تھا۔

”آہ نٹی دروازہ کھول آہ نٹی“

آہ نٹی نے تو دروازہ کھولا نہیں لیکن دروازہ کھل ضرور گیا دروازہ کھولنے
 والا کھلیش تھا۔ حمدو سے عمر میں بس سال دو سال کا بڑا ہو گا۔

”آہ نٹی کیا کرتی ہے“ حمدو نے اپنی اہمیت بتائی

”سو رہی ہے جی، تمہیں کیا کام ہے بتلاؤ؟“ کھلیش نے حمدو کو

لفظ ہی نہیں دی۔

لیکن حمدو کہاں ملنے والا تھا۔ اُسے علم تھا کہ جو بات وہ کہنے جا رہا
 ہے اُس کی اہمیت بھلا کھلیش کہاں جان سکتا ہے۔ قرتی آئی ہے تو گھر پر
 کیا گڑبگڑاتی ہے، مکینوں پر کیا بیت جاتی ہے۔ اس کی اہمیت سے حمدو واقف تھا۔

لہذا اس نے بڑے اعتماد سے کلیش سے کہا۔

”مجھے ذرا آنٹی ہی سے بات کرنی ہے“

کلیش کو حمد کی یہ رعونت بُری لگی اس نے ترخان سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ”جاگ پڑے تب آنا“

لیکن حمد نے دھکا دے کر پھر سے دروازہ کھولنا چاہا جو پوری طرح کھلا نہیں اس لئے کہ کلیش ٹپوں سے لگا کھڑا تھا۔ بلی کی طرح بدن چرا کر وہ ادھ کھلے پٹ میں سے اندر گھس گیا اور سینہ تان کر کلیش سے کہنے لگا۔

”اٹھاؤ آنٹی کو در نہ پھر راستہ نہ رو کو میرا۔ میں خود اسے جگا لیا گا“ اور کلیش کے جواب کا انتظار کئے بغیر حمد نے ترپ کر راستہ کاٹا اور کمرے میں داخل ہو کر روپ متی کو جھجھٹا دیا وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو حمد نے کہا۔

”اٹھ بھی چکو آنٹی قرتی آگئی ہے، قرتی“ وہ کچھ اس طرح کہہ رہا تھا

جیسے اس کو سب پتہ تھا کہ قرتی آنے والی ہے۔

”کون ہے یہ قرتی“ روپ متی بولی۔

”ارے“ حمد نے تعجب سے کہا۔

”ارے تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم آنٹی کہ قرتی کیا ہوتی ہے۔ ارے

آنٹی قرتی آتی ہے تو گھر کا سارے کا سارا سامان پچھری میں لے جایا جاتا ہے فرنیچر، ایلاریاں ریڈیو یہ سب تو پہلے ہی دھر لئے جلتے ہیں۔ پھر کپڑا لٹا ہانڈی برتن بھی تو نہیں بچتے“

روپ متی جان گئی کہ قرتی کیا ہوتی ہے لیکن وہ سمجھ نہ سکی کہ اس کے

گھر قرتی کیوں آئے گی۔ اس نے حمد کو ہاتھ پکڑ کر بڑی راز داری سے کہا۔
 ”حمد قرتی میرے گھر نہیں آئے گی۔ میں کسی کا کچھ دینا لینا
 نہیں ہوں۔“

لیکن حمد وچو کنے والا کہاں تھا۔ تین سال سے اس کی آنکھوں نے ہر
 سال قرتی کو دیکھا تھا جو معشوق علی کے احاطے میں ہر کرایہ دار کے گھر و باغ
 بن کر آتی ہے۔

حمد نے روپ مٹی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔
 ”آنٹی! تو تو پچ پچ کچھ نہیں جانتی۔ تیرے گھر قرتی اس طرح آئے گی جیسے
 اس احاطے کے سارے کرایہ داروں کے گھر آتی ہے۔“

روپ مٹی کو اس احاطے میں آئے ہوئے کوئی تین ماہ ہوئے تھے
 وہ کسی کاپڑ میں پڑھاتی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی کملیش اور ایک بہن تارا مٹی کے
 ہمراہ رہتی تھی جن کی وہ کفیل تھی اور سرپرست۔ احاطے کے مرد روپ مٹی کا اس لئے
 مان کرتے تھے کہ وہ احاطے بھر میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی عورت تھی، قبول
 صورت تھی اور ملنا رہتی اور سب سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ وہ کسی کی بیوی
 نہیں تھی۔ مرد اس سے ملتے جلتے تھے تو کوئی ایسا خوف ان کے دلوں میں نہ ہوتا تھا کہ
 وہ کسی دوسرے کی ملکیت پر غاصبانہ قبضے کی سوچ رہے ہیں اور اپنی اس خصوصیت
 اور وصف کے ناتے کہ روپ مٹی بیابانہ تھی وہ احاطے بھر کی عورتوں کی آنکھوں
 میں کنکر کنکر کھلتی تھی۔

حمد و ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا تو روپ مٹی نے جلدی جلدی پکڑے

درست کہے اور اس تجاہل سے باہر نکل آئی جیسے ترقی کی نسبت معلومات کو نہ نہیں
پتا بہت بلکہ کمیلیش اندازہ راکھی سرزنش کرنا چاہتی ہے کہ ادھر صبر ہوئی نہیں کہ یہ لوگ
نکل پڑے کہ کڑیاں بھرنے۔

لیکن جب وہ کھلے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی بالکنی پر آئی تو ایک
سراسیمگی سی جواد میں پھیلی ہوئی تھی۔

غور میں دو رازوں کے پتوں میں ادھ کھلی کھڑکیوں میں جالی دار
برآمدوں میں دینی چھپی باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں ایک موٹر دین میں ایک
بھاری بھر کم کالا بھنگ افسر تن کر بیٹھا ہوا تھا اور میونسپلٹی کی اصلیں اور جوان
اور باوردی انسپکٹر بڑی رعونت سے گھر والوں کی نقل و حرکت کو نظر میں رکھے
اپنے حاکم کے احکام کے منتظر تھے۔

اب روپ متی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حمد دے جو خبر اس تک پہنچائی ہے
وہ کچھ ایسی ناقابل اعتنا بھی نہیں ہے بلکہ دل ہی دل میں وہ اس کی اہمیت کو محسوس
کر رہی تھی۔ اس کو کچھ عجوبہ سا لگ رہا تھا جب وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اور آنکھیں
مکمل کر سوچ رہی تھی کیسی ”ضبطی“ ہے کہ احاطے کے سارے لوگ اتنے ہراساں ہیں
جیسے ضبطی ان ہی کے گھر آئی ہو۔

احاطے بھر میں صرف روپ متی ہی ایسی تھی جو ترقی کے بجائے ضبطی
کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ یہ بات بھی اس احاطے میں اس کو نواز دے ہوئے کی
دلیل تھی۔ مدد نہ احاطے کا ہر چھوٹا بڑا ترقی کے لفظ سے بخوبی واقف
ہو چکا تھا۔

روپ مٹی نے سوچا کہ باہر نکل کر معلوم کرنا چاہیے کہ آخر یہ ضبطی کس کے گھر ہے۔ سب سے پہلے اس کو گمان ہوا کہ ضبطی شاید مقابل کے مکان پر ہی آئی ہوگی جو ایک اردو ادیب کا مکان ہے۔ روپ مٹی جانتی تھی کہ اس کے گھر اکثر قرص خواہوں کی پورش دیتی تھی۔ جن سے یہ ادیب نرم گرم باتیں کیا کرتا تھا۔ راتوں کو یہ سارے فتنے سو جاتے تو جاگ جاگ کراوٹ پٹانگ کچھ لکھتا تھا اور بڑی تیزی سے بوڑھا ہو رہا تھا۔

روپ مٹی نے ننگے پیر ہی اس کے گھر کا رخ کیا تو اس نے دیکھا کہ جوالید ابرار آمد سے میں کھڑا ادیب کی بیوی سے گھل مل کر باتیں کر رہا ہے وہ قریب پہنچی تو اس نے دیکھا ادیب تہ بند باندھنے تل کے نیچے اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ بیٹھا بچے کو نہلا رہا تھا اور خود بھی نہا رہا ہے۔ باپ بیٹے صابن کا جھاگ اڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکتے، کلیلیاں کرنے میں لگے تھے۔ روپ مٹی نے اندازہ لگالیا کہ ادیب کے گھر تو صعب خیریت ہے پھر آخر وہ بد نصیب کون جس کے لئے یونسلٹی نے یہ سب اہتمام کیا ہے۔

شیرچی تیسرے ہاتھ میں لئے اس کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں جس میں اس کا بیٹا اور دلہن بند تھے۔ وہ خود بھی دروازہ کو آہستہ بجائیں۔ کبھی اس طرح باہر کی طرف دیکھتیں جیسے خود کچھ دیکھنا نہیں چاہتی ہوں بلکہ ان نظروں سے بچنا چاہتی ہوں جو انھیں دیکھ رہی تھیں اور سچ پوچھتے تو انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کا بیٹا اور بہو شاید رات اتنا جاگے تھے کہ ابھی تک ان کی صبح نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اسیلین تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر حمیدہ بانو کے گھر جا گھسی تھیں۔ حمیدہ بانو معشوق علی کی بیوہ بہو تھیں اور اب جبکہ معشوق علی اپنے کاروبار کے سلسلے میں ضلع پر پہنچنے لگے تھے تو بانو ہی کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتیں۔ یوپی کے کسی ضلع کی خاتون تھیں اپنی چرب زبانی اور نکھرے ستھرے ہنچ پر اس حد تک ناز تھا کہ کسی حیدر آبادی عورت کو خاطر ہی میں نہ لاتیں۔ عمر کے تقریباً ۴۵ سال کھا چکی تھیں لیکن چہرے کو لپ تھوپ کر جوان نظر آنے کی کوشش میں بڑی محنت شاقہ سے کام لیتیں۔ سارے کرایہ دار حمیدہ بانو کی کچھ اس طرح عزت کرتے جیسے بے گار کر رہے ہوں۔

جب روپ متی نے اسیلوں کو حمیدہ بانو کے گھر میں اطمینان سے ادھر ادھر پھرتے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ معشوق علی کی بہو جو کرایہ داروں کی بیگم صاحبہ بھی تھی اور جس کی زبان سے پھولوں کی بجائے خزاں رسیدہ درخت کی پتیاں جھڑتی تھیں اسی مری مری سی چپ چاپ سی کھڑی ہوئی ان اسیلوں کو تک رہی تھی جیسے جنم جنم کی گونگی ہو۔ روپ متی نے اس کو جب یو لے بس دیکھا تو ترس کھا کر رہ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ادیب کی بیوی سے اس ضلع کی نسبت کچھ استفسار کرتی، ادیب کی بیوی نے اپنی کہنی سے ہٹو کا دے کر اس کو کچھ بتلایا۔ روپ متی نے غور سے دیکھا کہ پہلوان نما مولوی کھٹ کھٹ مکروں کو مقفل کر رہا ہے اور جب وہ اپنا کام کر چکا تو اس نے حمیدہ بانو کو سر ہلا کر اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کام مکمل کر چکا ہے۔ مولوی کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ حمیدہ بانو کو اپنی کھوئی ہوئی گویائی مل گئی۔

» یہاں کیا پھر رہی ہو پاٹل جلی مغنہ۔ یہ کوئی معشوق علی صاحب کا مکان تو ہے نہیں۔ وہ سب مقفل کر کے مزے میں بزنس کرتے ہیں۔ اور تم ہو کہ ہم کرایہ داروں

کو ناک چینی جتوا رہی ہو۔ اپنے انسپکٹر صاحب سے کہو کہ وہ خود آکر اپنی آنکھوں معشوق علی صاحب کے کرتوت دیکھ جائیں۔ قفل توڑ کر سامان اٹھوالیں یا سیل بند کر کے ہر توڑے لگوادیں۔ آؤ۔ آؤ نہ میرے ساتھ۔ میں بتلاؤں تمہیں کہ انہوں نے اپنا سامان کہاں رکھ چھوڑا ہے۔“

اور حمیدہ بانو نے بڑھ کر دونوں اسیلوں کا ہاتھ تھام لیا اور لے چلیں ساتھ ساتھ۔ مقفل کمروں کو بتلا کر کہا یہ رہا ان کا مکان۔ یہ ہے ان کے مقفل کمرے جن میں اتنا سامان چھپا پڑا ہے کہ ترقی کی رقم سامان کو کوڑیوں کے مول بکوا کر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ دہی کرے تھے جو پہلون نما مولوی نے ابھی ابھی مقفل کئے تھے اور اشارہ پلاتے ہی حمیدہ بانو نے لن ترانی شروع کر دی تھی۔

حمیدہ بانو یہ ساری کاروائی دیکھتا کھڑا تھا اور حمیدہ بانو کی باتوں پر مسکرا رہا تھا اور بھول گیا تھا کہ اس کی نگر پھٹی ہوئی ہے۔ اسیلوں نے آٹے پاؤں لوٹ کر انسپکٹر کو بلایا ہے۔

روپ متی کا ہاتھ دبا کر ادیب کی بیوی نے کہا۔ دیکھا تم نے کیا دن دھارے آنکھوں میں مٹی جھونک دی بانو نے۔ روپ متی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس تکتی رہ گئی۔

حاجی اسد اللہ اپنا پٹا رہ لیا لڑاٹھا کے چھپا کے سے بیت الخلا میں گھس گیا جسے آپ لاوٹری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ حاجی اسد اللہ خود اسے ”لاوٹری“ کہنے لگا ہے۔ جب سے فلش سسٹم اس کے گھر آیا ہے۔

انسپکٹر نے احاطہ کے بچوں پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اس ساری

وسیع عمارت کا میونسپلٹی نمبر چونکہ ایک ہے اس لئے از روئے قانون اس کے مختلف حصوں میں جو کرایہ دار ہیں وہ اگر کرایہ دار ہوں بھی تو معشوق علی ہی تصور کئے جائیں گے امدان کا سامان معشوق علی کا سامان تصور ہوگا۔ ایسے میں جبکہ اتنے سارے گھر کھلے ہوں ہمیں بند کمرہ کی نقل شکنی کا کوئی جواز نہیں۔

”سمجھ گئیں“ ادیب کی بیوی نے روپ متی کو جھجھوٹ کر پوچھا۔

”یعنی تم بھی معشوق علی ہو میں بھی معشوق علی! روپ متی نے ادیب کی بیوی کو اس طرح دیکھا جیسے کھڑی اپنا بھائی بھائی گرتا ہوا گھر دیکھ رہی ہو جس کا سارا سامان ترقی کیا گیا ہو۔

”بولو ناب ہم کیہ کریں؟“

روپ متی زیادہ فکر مند ہو رہی تھی۔

حمیدہ بانو نے برابر انسپکٹر کو باتوں میں الجھائے رکھا تھا۔

”واہ! واہ! یہ اچھا قانون ہے۔ سب جرم و جرم اور شہر عزت داروں

پر رعب کئے۔

لیکن اصلوں نے انسپکٹر کا اشارہ پا کر احاطہ میں ریگنا شروع

کر دیا تھا۔

ایک اصل ظاہر میاں کی کبڑی بیوی سے اُلجھ رہی تھی جو اسے اپنے کمرے

میں داخل نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ کمرہ بھی کیا تھا حد اصل تہہ خانہ تھا جو ظاہر میاں

اکشنر کا مکان کہلاتا تھا۔ کبڑی بضد تھی کہ پہلے حمیدہ بانو کا سامان اٹھاؤ تب ادھر

نظر کرنا۔ انسپکٹر نے سمجھا یا کہ ہم ابھی کسی کا سامان نہیں اٹھا رہے ہیں صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ کتنا

سامان ہیں اٹھانے ہے اور کون اچھوڑ جانا۔ اگر کسی نے کوئی چیز یاد کرنے کی کوشش کی تو اس کے حق میں بُرا ہوگا۔

» اوسے یاد نہ کریں تو کون اچھا ہو جائے گا کسی کے حق میں ہم اپنا سامان یاد نہ کریں تو تم کو لوگے ہمارا سامان یاد۔ اے ہم کرایہ داروں پر اچھی افتاد پڑی ہے۔“

حمیدہ بانو کہے جا رہی تھی۔

گُمری نے حمیدہ بانو کو اس طرح تڑپ کر دیکھا جیسے مقتول آخری لگھاڑ اپنے قاتل پر ڈالتا ہے۔ گُمری کا بس چلتا تو وہ انیکلر کو کسی قدر تفصیل سے بتلا دیتی کہ یہ حمیدہ بانو جو تمہارے دماغ کا اپنی لن ترانی سے کچھ مر بنا رہی ہے۔ دراصل اس احاطہ کی مالک نہیں ہے۔ معشوق علی کی بہو ہے اور یہ مستند اصولی اس کا ہوتا سوتا ہے جو فارسی اور عربی پڑھانے گھر میں داخل ہوا تھا پھر واپس لوٹنے کا راستہ ہی بھول گیا اور مفت کی کھاتا ہے۔ معشوق علی بیچا ہے تو اپنی بہو کے احوال دیکھ کر گھر چھوڑ گئے وہ کچھ اور دن یہاں رہتے تو گھر کیا انھیں دنیا ہی چھوڑنی پڑتی۔

گُمری نے جب آخری نظر حمیدہ بانو پر ڈالی تب تک تو اسیلین اس کے تہہ خاں

میں گھس چکی تھیں اور ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

حاجی اسماعیل کی خوبصورت لڑکی آنسو پونچھ کر اپنے رنگ برنگے شرٹس

اور سلواریں صندوق میں سے نکال کر ایک اسیل کے سامنے ڈال رہی تھی۔

روپ متی نے ادیب کی بیوی سے پوچھا کہ سب اس قدر پریشان ہیں

اور تمہیں کوئی تشویش نہیں تو اس نے منہ پھلا کر کہا کہ ”روپی“ اب جو ہونی ہے

سو ہو کر رہے گی ہی۔ احاطے میں ہر سال قرق آتی ہے۔۔۔ معشوق علی کی پہچان جو
 مالکن بن کر برس کے بارہ ماہ کرایہ داروں پر حکومت چلاتی ہے اسی ایک دن کے لئے
 خود بھی کرایہ دار بن جاتی ہے اور سب سے زیادہ مظلوم نظر آتی ہے۔ مستند امولوی
 بڑی مشقتی سے ان کمروں کو مقفل کر دیتا ہے کہ چابیاں معشوق علی کے پاس ہیں۔
 اصلیں مڑ بڑ پھرتی رہتی ہیں۔ حمیدہ بانو اپنی زبان تنبیہ کی طرح چلاتی رہتی ہے اور کسی نہ کسی
 کرایہ دار کا مال دھریا جاتا ہے۔ قرق کئے ہوئے اس سامان سے ٹکس کی رقم اس طرح
 وصول ہو جاتی ہے کہ کرایہ دار بے چارہ جس کا سامان قرق کر لیا جاتا ہے کسی نہ کسی
 طرح رقم بھر کر اپنی چیزیں چھڑا لیتا ہے اور ماہ بہ ماہ کرائے میں سے وضع کرنے کا
 عمل شروع کر دیتا ہے۔ معشوق علی کو اطلاع دیدی جاتی ہے اور وہ چین سے اپنے
 دھندے میں لگے رہتے ہیں، وہ مسلسل کہتی گئی اور روپ متی بلیک جھپٹائے بغیر
 اسے نکلتی رہی۔

”حمیدہ بانو اپنے گھر برا جاتی ہیں اور پھر دو سترہ ہی دن سے مالکن بن
 بیٹھتی ہیں۔ مستند امولوی ساڈ کی طرح بڑا اینڈتا اور حمیدہ بانو کو فارسی عربی میں عشق
 کا درس دیتا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے پڑوسی کا سامان
 قرق ہوا ہے۔ وہ بد نصیب جس کا سامان اٹھالیا جاتا ہے وہ تنہا میو نیلی کے
 چکر کاٹت رہتا ہے۔ ہمارے گھر نہ ریڈیو ہے نہ بجلی کے پنکھے نہ سینے کی مشین
 نہ بڑی بڑی الماریاں۔ ان کی بڑی سوزنیز کھتی سودہ کچھلے سال اور لوگوں کے سامان
 کے ساتھ قرق کر لی گئی تھی“

”لیکن میرے پاس تو یہ سبھی کچھ ہے؟“ روپ متی پر رقت طاری

ہو رہی تھی۔

”کسی کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا ہوتا اور انسپکٹر سے کہہ دیا ہوتا کہ یہ کمرہ کسی اور کرایہ دار کا ہے۔ دیکھا نہیں اب حمیدہ بانو کس طرح آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں۔“

روپ متی نوٹنے لگی۔ کہا بہن ذرا دیکھ آؤں اپنا گھر کتنی ہی تو بامرجوم کی نشانیاں ہیں۔“

اور وہ ساری کی نہریاں سمجھاتی جب ادیب کے گھر سے باہر نکل رہی تھی تو دروازے میں حمد واس سے ٹکرا گیا۔ حد بہت پریشان تھا۔

”آنٹی افسر نے تیرا سامان اٹھا لینے کا حکم دیا ہے اور انسپکٹر تیرے گھر سے سامان نکلا رہا ہے اور تارا سسٹر اور کلیش بھیارو رہے ہیں تارا سسٹر تو بہت بہوت دور رہی ہے“

روپ متی دھڑکتے دل کو تھام کر ہر نوں کی طرح قلابچیں بھرتی اپنے گھر تک پہنچی تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسو تھے کہ اُٹ اُٹ کر آنکھوں تک چلے آتے تھے اور وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر ان آنسوؤں کو پیچھے ڈھکیل دیتی تھی۔

جب وہ بدحواس سی اپنے گھر میں داخل ہوئی تو انسپکٹر نے اس کو نظر بھر کر دیکھا لیکن وہ اپنے اٹھتے ہوئے سامان کو دیکھ رہی تھی — اسے ایسی تنی سدھ بد بھی نہ تھی کہ ڈھلکا ہوا آئینہ ہی برابر کو اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”ہم کرایہ دار ہیں“ اس نے انسپکٹر سے کہا۔

”آپ کچھ کیجئے نہ۔ کرتا کون ہے بھوگتا کون“ اور روپ متی نے محسوس کیا کہ کچھ اور وہ کہے گی تو روپڑے گی۔

انسپکٹر نے اس کی بھیگی ہوئی پلکیں دیکھیں تو پوچھا کہ کوئی مرد نہیں ہے اس مکان میں؟

روپ متی نے طوفانوں کو روکنے کے لئے جتنے بند باندھ رکھے تھے وہ ایک دم سے ٹوٹ گئے اور آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا ”ہمارا کوئی نہیں ہے۔ میں تارا اور کلیش بس یہی سب کچھ ہیں۔“

انسپکٹر نے محسوس کیا کہ روپ متی کو کسی مرد کا ایسا سہارا چاہیئے کہ جو گھر کے اٹھتے ہوئے اٹاٹھ گئے لئے مینہ پیر ہو سکے۔ اُسے ایسا لگا کہ روپ متی کا عورت پن ہی سر سے قرق کر لیا گیا ہے اور وہ تو اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی پرورش کا ایک ذریعہ ہے جو آہستہ آہستہ بھول رہا ہے کہ آنچل ڈھلک جائے تو اسے برابر کر لینا چاہیئے۔ جب کہ کسی مرد کی بھوک کی نگاہیں اُسے تک نہ ہی ہوں۔

لیکن روپ متی تو سب کچھ بھولی ہوئی اپنے اٹھتے ہوئے سامان اور ہوتی ہوئی بہن کو تک نہ ہی تھی اور جب اس نے خود اپنے آنسو خشک کرنے کے لئے آنچل سمیٹا تو انسپکٹر نے کہا ”میں پوری کوشش کروں گا کہ رتم ادا کر کے آپ کا سامان واپس لے آؤں۔ آپ کرایہ ہر ماہ مالک مکان کو ادا کرنے کی بجائے اس رتم کی ادائیگی تک مجھے دیا کریں۔ کئیے منظور ہے نا“

روپ متی نے قبل از قبل ہی اس کے احسان کا اعتراف کیا اور ایسی بے بس نظروں سے اُسے دیکھا جیسے احسان اٹھانے اور بک جانے کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

انسپکٹر نے کچھ سوچ کر روپ متی سے کہا۔
گھر کی یہ ساری چیزیں آپ کو بہت پیاری ہوں گی۔ کیوں ہے نا؟
روپ متی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر آپ یوں کیجئے“ وہ کہنے لگا کہ ”ہمارے افسر سے ہفتہ بھر کی ہمت لے لیجئے۔ اس سے کہئے کہ رتم ایک ہفتہ کے اندر اندر آپ ادا کر دیں گی اور اگر ایمانہ ہو تو وہ سامان قرق کر سکتے ہیں۔“
”مان جائیں گے وہ؟“

روپ متی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
”آپ کہیں گی تو مان ہی لیں گے“ — انسپکٹر نے غم کے ہیرہ کی طرح جواب دیا۔

روپ متی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس طرح موٹر وین کی طرف بڑھی جیسے دہن ڈولی میں سوار ہونے جا رہی ہو۔ جب وہ افسر سے بات کر کے لوٹ رہی تھی تو انسپکٹر اس کا اٹھایا ہوا سامان اس کے گھر میں دسپوزر رکھوا رہا تھا۔

”مبارک“ انسپکٹر نے روپ متی کو برابر سے گزرتے ہوئے

دیکھ کر کہا۔

”کتنی مہلت دی ہے“ روپ متی نے پوچھا۔

”صرف تین دن“ — انیکٹر نے جواب دیا۔

”پھر کیا ہوگا“ — روپ متی نے اس قدر بے اختیار ہو کر انیکٹر

سے پوچھا جیسے اس کو اس کا وعدہ یاد دلا رہی ہو — پھر خود ہی خود سوچ کر جھینپ گئی۔

انیکٹر بڑے اعتماد سے مسکرا دیا۔ اس نے کہا ”ہو جاتے گا

سب کچھ“

جب میونسپلٹی کے لوگ نوٹن لگے تو اڑوس پڑوس کے وہ لوگ جو

روپ متی کا سامان اکٹھا ہوا دیکھ کر جمع ہو گئے تھے آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

میونسپلٹی دین جلنے لگی تو حمد نے سپاہی کی طرح افسر کو سلوٹ کیا۔

حمد بڑا خوش خوش نظر آ رہا تھا وہ بھول گیا تھا کہ اس کی نکر تہچھے سے مٹھی ہوئی ہے۔

مسند مولوی آنکھ مار کر حاجی اسد اللہ سے کہہ رہا تھا ”معاملہ

نیٹا لیا ہوگا۔ روپ متی بڑی عشوہ طراز ہے“

حمد و جب روپ متی کے گھر بیٹھیاں چڑھ رہا تھا تو گلش نے

قریب قریب اس سے چپٹ کر کہا ”چاکلیٹ کھائے گا۔ حمد۔ اور اس سے

پہلے کہ حمد کچھ جواب دیتا اس نے حمد کے منہ میں اپنے ہی ہاتھ سے چاکلیٹ

ٹھونس دیا اور جب چاکلیٹ منہ میں دبا کر حمد نے جست لگائی تو وہ ظاہر میا

کی کٹری بیوی کے تہ خانے کے سلنے تھا۔

حمیدہ بانو دیکھتے کے دیکھتے پھر بالکن بن بیٹھی تھی۔ دوسری کراہی عورتیں اس کی چاپلوسی کرتی اس کے اطراف جمع تھیں۔ وہ بالکل بھولی ہوئی تھی کہ مستندے مولوی کی آغوش میں ہوتی ہے تو سب کچھ جان کر بھی اس کے کراہیہ دار ایک لفظ اسے نہیں کہتے۔ معشوق علی سے جب سب کچھ دیکھا نہ گیا تو اس نے گھر چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی لیکن کراہیہ داروں نے معشوق علی کے جلتے ہی حمیدہ بانو کو اس کی جگہ مختار کل مان لینے میں دیر نہ کی۔

حمیدہ بانو کہہ رہی تھی ”روپ متی کے پاس روپ کا جادو ہے چاچی۔ مولوی صاحب کہتے تھے۔ سو سو خروں سے رجھایا اس نے میونسپلٹی کے افسر کو۔ اٹھایا ہوا سامان رکھوایا گیا ہے وہ۔ اب ہے کیا گلی کھلائے گی یہ روپ متی۔“

چاچی جو حاجی اسد اللہ کی بیوی تھی اس طرح آنکھیں پھاڑ کر یہ سب کچھ سن رہی تھی جیسے اپنے دو سوسوں اور شکوک کی تصدیق ہونے پر اسے اچنبہ کم دکھ زیادہ ہو رہا ہو۔

حاجی سید اسد اللہ ادھیڑ عمر کا گڑا آدمی تھا۔ بٹری اس شان سے پیتا تھا جیسے سگار پی رہا ہو۔ صبح آنکھ کھلتی تو رات بستر پر جانے تک اسے آسمان دیکھنے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ادب بھی سنتا تھا۔ چلتا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے راستے پر کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ لیکن تھا بڑا دلچسپ آدمی، باتیں بڑے مزے کی کرتا۔ عورتیں بغیر کسی تکلف کے اسے گھیر لیتیں اور وہ انھیں خوب ہنساتا لیکن چاچی سمجھتی تھی کہ زمانے بھر کی عورتیں گڑے حاجی پر فر لیتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ روپ متی کے گھر بھی چلا جاتا۔ روپ متی اس کی بڑی مہارت کرتی اور وہ ان سب کو ہنساتا۔ ایک دن جب چاچی نے روپ متی کو اس کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے سُن لیا تو حاجی اسد اللہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاچی نے بات کو اتنا بڑھایا کہ اپنا بوریا بستر اسمیٹ کر کسی رشتہ دار کے پاس نکل کھڑی ہوئی تھی۔ احاطے بھر میں جب سمجھوں کو چاچی کی خفگی اور ہجرت کی وجہ معلوم ہوئی تو ہنس ہنس کر لوگوں کا بُرا حال ہو گیا۔

حاجی اسد اللہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مردوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے کہا تھا۔

”یہ جو ظاہر میاں کی بیوی ہے نا اس سے مسیکرہ دمانس کی بات چلتی تو پھر کچھ بات بھی تھی سمجھوں نے ظاہر میاں کی بیوی کی طرف دیکھا۔ یہاں تک کہ خود ظاہر میاں نے بھی اور سب ہنس پڑے تھے۔

آج جب چاچی کو حمیدہ بانو روپ متی کے غمزوں اور خردوں کی بات مولوی صاحب کے حوالے سے سُنائی تو چاچی کے سوئے ہوئے دسمو سے پھر سے جاگ اُٹھے۔

”اے ان غمزوں کو تو کوئی حاجی اسد کے دل سے پوچھے۔“

شیکرے کی نماز ادا کر دیجی، جو اگر یہ جادو تمہارے میاں پر چیل جاتا تو حمیدہ بانو نے کہا۔

”ہاں بی بی وہ تو کروں گی ہی۔ اچھا ہی ہے۔ چاچی نے کچھ

سوچ کر کہا — کسی ایک سے لگا رہے نایہ فتنہ تو احاطے بھر کے مرد محفوظ رہیں گے۔ شکرانے کی نماز تو ہم سب کو ملکر ادا کرنی چاہیے۔

سر شام انسپٹر روپ متی سے ملنے کے لئے پھر آیا تو اس نے اندرہ کر بھی ملنے سے انکار کر دیا۔ کہلا بھیجا بیمار ہے نہیں مل سکتی اور یہ بھی کہ قرتی کی رتن بن پڑے گا تو وہ خود ادا کرے گی ورنہ جو بھی ہو گا اسے نبٹ لے گی۔

دن بھر پڑوسنوں اور احاطے کے مردوں کی باتیں سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔ دن بھر وہ روتی رہی تھی۔

انسپٹر جا چکا تو مستند مولوی اور حاجی، اسد اللہ دل ہی دل میں خوش تھے کہ انہیں روپ متی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کا بے قاعدہ قانونی حق پھر سے مل گیا ہے جو چھینا جا رہا تھا۔

عورتیں اب ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں ”صاف جلے گئی ہے روپ متی انسپٹر کو وہ بھلا کسی ایک کی ہو کر رہ سکے گی؟“

میں

بھی

نہ

تھیں

بھی

کھڑکی

تمہاری آنکھیں تو وہ آئینہ تھیں جن میں جھانک کر میں اپنے خلد خال
 ہی نہیں اپنی روح کا عکس بھی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب یہ آئینہ خانہ ایک ایسا حیرت کدہ بن
 گیا ہے جس میں جھانکتا ہوں تو اپنی صورت تک پہنچانی نہیں جاتی۔ ہم کبھی اتنے اجنبی تو
 نہ تھے اس وقت بھی نہیں جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا — جنم جنم
 کا ساتھ دینے کی قسمیں کھانے والے ہم لوگ اپنی محبتوں کو زندگی کے دکھ درد سے بچا کر
 ابد تک دودے جاسکتے ہیں۔ اب تو ہمیں اس کی بھی خبر نہیں — اور پھر سچ پوچھو
 تو ہمارے پاس اس کے سوا کچھ بھی کیا — لیکن کیا تم آج بھی مجھے چاہتی ہو؟
 — کیا میرے لئے آج بھی تم میں وہی دل کشی ہے؟ — اگر ہے تو پھر
 یہ دوری کیلئے — ایسا کیوں ہے کہ وہ جو تم ہو، تم نہیں ہو — وہ جو
 میں ہوں، میں نہیں ہوں۔

ہم سر جھکائے ایک ہی ڈگر پر اس طرح چل رہے ہیں جیسے منہ اٹھائے
مخالف راستوں پر چل رہے ہوں — میں جو باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں ان کا تعلق
نہ گھر کے کرائے سے ہے جس کا تقاضہ ہم پر ہو رہا ہے نہ گوالن کی تنک مزاجی سے کہ
اس نے کل سے ننھے کا دودھ بند کر دینے کی دھمکی دی ہے۔

— میں تو تم سے جسم و جان کی باتیں کر رہا ہوں — منہ بند سیپ میں
چھپے ہوئے اس سچے موتی کی باتیں کر رہا ہوں جو تم نے اپنے سینے سے میرے سینے میں
منتقل کیا تھا۔ روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی التجاؤں اور دعاؤں کی باتیں کر رہا ہوں
— ایسی باتیں کر رہا ہوں جنہیں ہم بھولتے جا رہے ہیں — تمہیں یاد ہے
— کبھی تم نے مجھے لکھا تھا کیا لکھا تھا تم نے مجھے بھی تو پوری طرح یاد نہیں
— شاید تم نے معصومیت سے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میں دفتر سے تھکا ہارا

گھر لوٹوں گا تو تم مجھے آرام کرسی پر گرادو گی — بڑے چاؤ سے میرے جوتے کی
ڈوریاں کھولو گی — میرے کوٹ کے بٹن کھولو گی — ان غزو طی خانہ
انگلیوں سے جن سے میری زندگی کی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں تم نے جوتے کی ڈوریاں
اور کوٹ کے بٹن کھولنے کا بیان کیا تھا — تم نے تو پھر اسی زمین پر رہ کر بات
کی تھی، شاید اسی لئے کہ عورت ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو اپنے
پیروں کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتی — لیکن میں تو زمین کی پستیوں سے اتنا
بلند ہو گیا تھا کہ ستارے میری نظر میں سنگریزوں کی طرح ماند پڑ گئے تھے، شفقت کی
سرخیاں دل پر خوں کا عکس بن گئی تھیں جو آنکھوں میں اتر کر آنسو بن جاتی تھیں۔
لیکن ہاتھ نہ سنگریزے ہی آئے تھے نہ آنسو — اور نہ میں چلتے پھرتے انسانوں

کے جنگل میں تمہارے نرم و نازک وجود سے شفقتی کا گراں بار بوجھ اٹھائے تنہا تنہا
و با جادہ ہاتھا، لیکن اس دامادگی کے باوجود مجھ میں دنیا بھر پر چھا جانے کا حوصلہ
تھا۔

اسی حوصلہ کے سہارے جب میں نے ہاتھ پکڑ کر تمہیں زمین سے اوپر اٹھالیا
تو ہماری محبت زندگی کا بوجھ سہار نہ سکی اور ہم زمین پر لوٹ آئے۔ یہ دایہ
تو مبارک اور مسعود تھی ہم چلتے بھی تو یہی تھے تاکہ جن کا بھول بن کر نہیں۔ صبا کی رفتار
بن کر چلیں۔ اوس کے موتی بن کر سورج کی کرنوں میں زندگی کو گم کر دیں۔ لیکن میرے کوٹ
کے بٹن سرے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تمہیں فرصت یک نگاہ بھی کہاں تھی۔ ہم نے
کب سوچا تھا کہ یہ دھرتی جس پر ہم ساتھ ساتھ قدم اٹھانے کے لئے لوٹ آئے ہیں
یوں بھی ہو گا کہ ہمارے پردے سے سرک جائے گی۔

اب یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے۔ جب میں دفتر سے گھر لوٹتا ہوں تو ہم ایک
دوسرے کو کیسے اجنبی سے لگتے ہیں۔ جیسے جانتے تو ہوں لیکن پہچان نہیں
پا رہے ہوں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سارے
گھر کی صفائی کے بعد چہرے اور بالوں پر آٹے ہوئے گرد و غبار کو ابٹن اور غارہ
سمجھ کر اس طرح مٹائیں ہو جاتی ہو کہ مجھے تمہارے چہرے کی یہ بیوگی اچھی نہیں لگتی
۔ اس بات کی تلخی شاید تمہیں کھل گئی تھی۔ تم نے دوسرے دن بناؤ سنگھار کیا۔
اور جب میں گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں اجالے اجالے سے نظر آئے۔
لیکن تم بہت جلد بھول بھال گئیں کہ میرے لئے تمہیں یہ اہتمام زندگی بھر کو ملے خواہ
گھر کا سارا بوجھ سمیٹتے سمیٹتے تمہارے ہاتھ شل کیوں نہ ہو گئے ہوں۔

پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا ہوں کہ چلو تم نے ٹھیک ہی کیا درتہ کہیں اس
اجلے کا تصور بھی مٹ جاتا تو — اکیونکہ تمہارے کنوارے اظہار میں کو سہاگ
کی پروگی شکار نہ تو میرے بس میں تھا لیکن تم سے اس سہاگن بیوگی کو چھین لینا خود
میرے بس میں کہاں ہے۔ جی چاہتا ہے اس سے پہلے کہ تم اس معاشرہ کے ہاتھوں
ایک پستی پھرتی کہانی بن جاؤ اور میں ایک جیتا جاگتا انسانہ تم سے جی بھر کے محبت
کی باتوں کر لوں — ایسی باتیں جن کا اسکول کی فیس نہ دے سکنے کے باعث
ندو گئے امتحان میں عدم شرکت سے کوئی تعلق نہیں ہے — نہ ہی ان باتوں کا
تعلق تمہارے ان ننگے ہاتھوں سے ہے جن میں چوڑیاں نہیں بجھتیں نہ سونے جھکے سے
جس میں کالی پوت کا بچھا تم کبھی ضروری سمجھتی تھیں — ہم شاید زندگی کی ان مہلات
سے بہت آگے نکل آئے ہیں یوں کہ ہم لوگ بڑھے لکھے لوگ ہیں، سمجھ دار لوگ
ہیں میں تم سے ان چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں جس کو
کبھی تم نے اور کبھی میں نے قتل کر دیا ہے — مجھے تو تم سے محبت کی باتیں کرنی ہیں۔
— تم سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا ہمیں اپنے سن و سال کی ساری پونجی کھو کر ایک
دوسرے کو سمجھنے بغیر ہی اس دنیا سے گذر جاتے ہیں؟

مجھے تو تم سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس دن جس دن تم اپنے دورِ افتادہ بھائی
کو کوسنے دے رہی تھیں کہ اس نے تمہاری زندگی تباہ کر دی اس لئے کہ وہ تمہاری اور
میری محبت کو پروان چڑھانے میں ایک وسیلہ رہا تھا، مجھے بتاؤ کیا تم یہ سچ کہہ
رہی تھیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اتنا بھیا نک سچ تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس لئے
کہ سچائی اگر موت کی طرح سفاک ہو تو زندگی کے خوب صورت جھوٹ میں

اُسے چھپالینا چاہیے۔

ہم افسانہ میں لے کر تو کچھ آئے نہیں تھے نہ کچھ لے کر جائیں گے ہی لیکھ
ایک دن سکر کو کچھ دے لینے میں کیوں بخل سے کام لیں۔

اسی لئے تو میں تم سے آج صرف محبت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔
فی الوقت تم بھی اس حقیقت کو بھول جاؤ میں بھی اس حقیقت سے آنکھیں چرا لیں کہ
ہم اپنی محبت کی باتیں ختم کر لیں تو مجھے دانہ دانہ کی تلاش میں سرگرداں ہو جانا ہے
اور تمہیں ننھوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر روٹیاں بیلنی ہیں اور انھیں جھوٹی سیجی
کہانیاں سنائی ہیں کہ پرستان کا شہزادہ ٹھنڈے میٹھے پانی کو دودھ سمجھ کر
پی جاتا تھا۔

مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا تھا کہ نہ تم کو مجھ سے نفرت ہے نہ
مجھے تم سے۔ بات اتنی سی ہے کہ تم میری چپ کو پہچان لو میں تمہارے آنسوؤں
کا واؤ جان لوں۔ ہم ایسی کٹھ پتلیاں ہیں کہ جن کی ریشمی ڈوریاں ہمارے معاشرے نے
اپنی انگلیوں پر لپیٹ رکھی ہیں لیکن بد نصیبی یہ ہے کہ ان کٹھ پتلیوں کا ذہن ہے
جذبہ ہے احساس ہے اور جب تک یہ سب کچھ ہے گا نہ ہم مل جل کر خوش
وہ سکیں گے نہ بچھڑ کر زندہ، اس وقت تک جب تک کہ یہ ریشمی ڈوریاں
کٹ نہیں جاتیں۔

میری چپ سے تمہارے آنسوؤں تک جو راستہ جاتا ہے۔ وہ ایک
ایسا پل صراط ہے کہ ہم پاؤں تریں تو پھر کوئی پرکشش نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ
لوہار کی دھول پر چلنا خشک آنسوؤں کے نیزے کی انی کو دل میں ترادو کر لینے

سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ۴

جی چاہتا ہے کہ تمہارا ہاتھ تھامے ماضی کے ایک ایک چمن زار میں گھوم پھریں
 کچھ کلیاں پھر سے تمہارے راستے میں پھانسیں اور جب تم انہیں روند کر گذر جاؤ تو میں چمن کو اپنے
 دامن میں محفوظ کر لوں کہ ان پر تمہارے نقش کف پائیں۔ اور اگر ایسے میں اپنی موٹر سائیکل
 پھٹ پھٹا نعلے والا سیٹھیا اس چمن زار میں در آئے اور میرا راستہ روکے تو نہ تم کچھ پروا کرو
 میں کچھ برا مانوں کہ اس عزت و توقیر کی میت کے اٹھ جانے سے ہماری محبت کو کیا
 لینا دینا ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم لوگ کیسے پاگل سے لوگ ہیں زندگی سے کچھ بھی
 تو نہیں مانگتے صرف اتنا حسن سلوک مانگتے ہیں کہ ہمارے بعد زندگی پر یہ حرف نہ
 آئے کہ اس نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔

تمہیں یاد ہے کہ ایک سہانی شام کو ہم اپنی اداسیاں سیٹے چل پڑے
 تھے کہ شاید کہیں پہل جائیں۔ تم اس کوشش میں تھیں کہ مجھے خوش نظر آؤ میں تمہیں یہ
 بتلانا چاہتا تھا کہ واقعی شام کتنی — خوب صورت ہے کیونکہ مجھے ایک کھجانی
 کا بہتر معائنہ ملا تھا۔ جب ہم بستی چھوڑ کر اتفاقاً اس باغ کے قریب آ گئے جہاں ہماری
 محبت کی ابتداء ہوئی تھی تو میں نے گفتگو کا مونس بدل دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس
 وقت تم مجھ سے اس قرض کی بات چیت کا آغاز کر چکی تھیں جو مجھ سے میری
 انا چھین رہا تھا اور تم سے تمہارا حسن میں نے تم سے کہا تھا — ہٹاؤ بھی —
 دیکھو شفق کیسی پھول رہی ہے۔ اور وہ حد نظر پر کون کس سے مل رہا ہے۔ کیا
 وہ بھی ہم ہی تو نہیں؟ لیکن کوئی پور تھا جو اس وقت بھی میرا دل میں گھسا میری محبت کی

نگری لوٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم سم اس بارغ میں داخل ہو گئے تھے جس کے پھول مرجھا چکے تھے جس کے گمڈے ٹوٹ گئے تھے جس کی کیا ریاں اڑ گئیں تھیں جس کی روشیں خاردار جھاڑیوں میں الجھ چکی تھیں اور وہ مکان جس کے محراب میں دیا جلا کر تم مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرتی تھیں، کیسا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنا وجود بھی تو بالکل اسی مکان کی طرح لگا جیسے ایک کھنڈر کے مقابل کھڑا ہوا درم حیران حیران نظروں سے دونوں کو تک رہی تھیں۔

یہ کیسا دکھ درد ہے کہ ہم ہجر کی لمبی راتوں کا کرب آج وصال کے لمحے لمحے میں محسوس کرتے ہیں۔ تم نے تو یہ سوچ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میرا ہاتھ تھام لوگی تو میں خود کو فراعہ مکان دزماں سمجھنے لگوں گا۔ اور میں نے یہی کچھ سمجھا بھی لیکن اگر تمہارے ہاتھ جن میں پھولوں کی کو ملتا تھی۔ اب اتنے کھردرے ہو گئے ہیں کہ میرے اپنے ہاتھوں کی بے حس اس لمس کے فرق کو بھی محسوس نہیں کر سکتی ہے تو بتاؤ میں کہاں قصور دار ہوں تمہارا کہاں دوش ہے۔ محبت تو انسانی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمہاری عرق عرق پیشانی سے اگر محبت مرجھا جاتی ہے۔ میرے ذہن کی تابانی سے اگر سینے میں اندھیرے سے جنم لیتے ہیں تو نہ تم محبت کو بد دعا دونے میں اپنے شعور کے اجالوں کو قتل کروں۔ بعض اوقات کبھی چھوٹی چھوٹی مصلحتیں زندگی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی کی چلی کھاتی ہیں۔ ہم اپنے مجروح احساسات کو چھپا لینا چاہتے ہیں تو مسکراہٹ میں بھی یہ جراثیم بکھر جاتی ہیں اور یہ تبسم کیسا زخمی دکھائی دیتا ہے۔

میں نے تمہاری خوشی کو اپنی خوشی اور تمہارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے

کی جو باتیں کی تھیں کیا میں وہ سب بھول گیا ہوں؟ — پھر بے سمجھت اڑ جانے کی سوچنے والا میں؟ پھر کٹے پرندے کی طرح زمین ناپ رہا ہوں۔

بس ایک جینے کی ڈگر سی پڑ گئی ہے جس کو میں عادت کا نام دے کر اپنی شکست خوردگی کے احساس کو نرم کر لیتا ہوں۔ ابد تم مضحکہ اسی کو میری محبت سمجھ لیتی ہو۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ جس دن چھپ کر اپنے گھر آیا تھا۔ میں نے پہلی کاپی تم کو نذر کی تھی۔ میں کتنا مطمئن مطمئن سا تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر بستا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن تھلے دل میں دور دور تک مامتا کی کوئی کرن نہیں تھی۔ تم نے مسکرا کر یہ کتاب قبول کر لی۔ میں نے اس مکان میں زخموں کا ایک چمن دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ ہم نے اپنا آبائی گھر چھوڑ دیا تھا۔ ناقابل برداشت قرض کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا وہ اس کتاب میں لگ گیا تھا۔ تم تو ماں ہو تم نے ہی سوچا ہو گا کہ کہانیوں نے گھر بنا لیا پر حقیقتوں کا گھر نیلام ہو چکا ہے۔ تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ میں نے تمہیں چھپڑنے کے لئے کہا تھا۔ — اپنی کہانیاں مجھے بڑی پیاری ہیں کیوں کہ میں نے انہیں جنم دیا ہے۔ وہ میری معنوی اولاد ہیں۔ لیکن ان سے تمہارا سلوک سوتیلی ماؤں کا سا کیوں ہے؟ تم مکرانے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ پھر ابدیدہ ہو گئیں اور تمہارے آئینہ میرے پہلے مجموعے کی پہلی کاپی پر گر پڑے جو تمہارے ہاتھوں میں تمہاری نظروں کے سامنے کھلا ہوا تھا اور میں نے تمہارے ہاتھ سے اپنی یہ کتاب واپس لے کر بڑے جتن سے بک شیلف میں سجادی کہ اس میں میرا خون جگر بھی شامل

ہے تمہارے آنسو بھی۔

تم ہی بتاؤ کہ اپنی محبت میں اس بات سے تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ میں ایک عظیم زبان کا ادیب ہوں جس کی موت کے بعد مستقبل کو اس کی تحریر کا ایک حرف ہی ملت ہے اور اس کی قبر کا نشان۔ لیکن اپنی نسل کے بہت سے دیوانوں میں اگر میں بھی شامل ہوں اور ہم اپنے اپنے خون سے دیئے جلائے ایک دوسرے ہی کو راستہ سمجھانے چلے ہیں تو کیا تمہیں اس دیوانگی پر پیار نہیں آتا جو مستقبل سے اس لگائے بغیر ہی اپنے حال میں مست ہے۔

گنجایس

اُس کو جدا ہوئے تین برس بیت گئے ہیں۔ آج اس کی تیسری برسی ہے۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

میں جانتا ہوں گنجائسہ الدین اس کا دیوانہ رہا ہے۔ مسیح الدین میرا گہرا دوست ہے۔ وہ گنجا ہے۔ میں محبت سے اس کو چھڑنے کے لئے گنجائسہ پکارتا ہوں۔ اس نے تکلفی کے لئے آپ مجھے معاف کر دیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ گنجائسہ اپنے مرحوم بیٹے کا دیوانہ رہا ہے۔ میں نے باپ بیٹے بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسے باپ بیٹے نہیں دیکھے۔ گنجائسہ کی اپنے بیٹے سے محبت کچھ دیوانگی کی حد تک تھی۔ مجھے تو کئی بار گنجا نے پرشہ ہوا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ راستے گند رہے ہوں اور اس کوئی سے لوٹتے بچوں کے قول میں اگر اس کو اپنا تیرہ سالہ قیر و نظر نہ آتا تو اس کی بے قراری کا عالم دیدنی

ہوتا وہ کچھ نہ کچھ بہانہ تراش کر ٹھٹھا جواسکول سے قریب ہی تھا — اذنیو
کو دیکھ آتا۔ اس سے مل کر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔

”بھئی تم نظر نہیں آئے — کس راستے سے آئے ہو۔ کب آئے ہو۔“

”اچھے ہونا“

میں گنجے مسیح کو سٹننے کے لئے اضافہ کرتا۔

”کیوں آئے ہو نام کیا ہے۔ مجھے پہچانتے ہونا میں کون ہوں“ —

افردہ دونوں ہنس پڑتے، پھر فیرو کی فرمائشیں شروع ہوتیں — پٹنگ چار قسم
کے مائیکے پاپین کیسیٹیں یعنی دھاگے کی کنگھیاں۔ مائیکے میں گندھگے مائیکے کے لئے
بطور خاص ہدایت کی جاتی۔

اس سے اس طرح ملاقات کے بعد گنجے مسیح نارمل آدمی بن جاتا۔ ایسے
میں اس کو دیکھ کر لگتا کہ دنیا بھر کا سکون، دنیا بھر کی راحتیں اسی ایک آدمی کے حصے
میں آگئی ہیں۔ جیب اجازت دیتی تو فیرو کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں جو خوشی
اسے محسوس ہوتی وہ شاید اس کی ایسی خوشی ہوتی تھی جسے ہم وقت کا حاصل کہہ سکتے
ہیں — اور اگر وہ ان چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو پورا نہ کر سکتا تو اس کے ذہنی کرب کا
عالم بھی احساسات کیلئے ایک تازیانہ ہوتا۔

گنجے مسیح کی اس دیوانگی کی داستانیں بڑی طویل ہیں۔ کوئی وجود کسی وجود
کے لئے اب بکھوں کی بیانی بن جائے، قوتِ سماعت بن جائے، نفس کی آمد و شد بن جائے
احساس و شعور نہیں بلکہ خود ذہن بن جائے تو ایک دوسرے سے جدائی بہتر ہے۔
تاکہ کسی ایک وجود کی تکمیل ہو سکے۔

شاید کچھ ہی سوچ کر تیرہ سالہ دوستی کے بعد فیرو نے گنجی مسیح کو تنہا چھوڑ دیا۔ میں تو بس حیران رہ گیا۔ یہ گنجی مسیح آخر زندہ کس طرح ہے۔ مرکیوں نہیں گیا۔ مجھے تو یوں غموس ہوتا تھا کہ اب اس کی زندگی بے مقصد ہے۔

مجھے یاد ہے — جب فیرو اس دنیا کو چھوڑ رہا تھا تو گنجی مسیح کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ نکلی — وہ اضطراب، دم بے قراری جو اسکول کی راہ میں فیرو کو نہ پا کر اس پر طاری ہو جاتی تھی آج تو اس کا ہنگامہ نہیں پتہ نہ تھا — بس ایک چپ تھی امداد وہ تھا۔

جب فیرو کی ماں، دادا، دادی اور دو سر دشتہ دارمین کر کے ادا چلا کر رونے لگے تو وہ بے کل ہوا اٹھا — انگلی ہونٹوں تک لا کر اس نے شو شو کی آوازیں نکالیں اور سب کو منع کرتے ہوئے بولا —

”چینو نہیں وہ گھبرا جائے گا“

میں سمجھ گیا کہ گنجی مسیح اب گیا ہاتھوں سے۔ وہ تو اب بھی اپنے فیرو کی زندگی کو منوانے پر مقرر ہے۔

اس کی چپ کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے — کسی نے اس کی بیوی سے کہا اس کو رلاؤ۔ بیوی بیچاری خود اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی — وہ اٹھی — اس نے کہنے سننے پر عمل کر کے گنجی مسیح کو ٹھپڑ لگائے — ”تم دو دو — روتے کیوں نہیں ہو“ — وہ خود دو دو کر چیخ رہی تھی — لیکن گنجی مسیح نے صرف اتنا کہا —

”میں اچھا ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔“

پھر وہ اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے اپنے فیرو کی پتنگ اونچی الماری پر چھپا رکھے تھے۔ اس نے ایک پتنگ نکال کر آنکھوں سے لگالیا اور چاہا کہ اس کے سہارے رو پڑے۔ لیکن وہ رو نہ سکا۔ پتنگ کا کچا رنگ اس کے آنکھوں اور گالوں پر آجھرایا لیکن آنسو دھردھرتک نہیں تھے شاید اس لئے کہ آنسو اس بات کا اعتراف تھے کہ فیروز زندہ نہیں ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا گئے مرنے کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔

پھر وہ چپکے سے اس کمرے سے نکل آیا اور اپنے فیرو کے پاس جا کر چپ چاپ بیٹھ رہا جو گہری غیند سو رہا تھا جس کو مرنے کی موت مان لینے کے لئے تیار نہ تھا۔

دن گذرتے گئے۔ اور اپنی چپکے سہارے گنجائش زندگی کی ہابھی کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے لگا۔ لیکن اس کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود کی دھجیاں بکھر گئی ہیں۔ اس کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ وہ لاتوں کو نیند میں سبک سبک کر رہا ہے۔

آہستہ آہستہ وقت کا موسم اس کے زخموں کو مندرمل کرنے لگا تو اس نے بھی یادوں کی ایک انجن سجالی۔ ایک دن وہ ایک خوبصورت سائیکس بنا لایا۔ اپنی کتابوں کے شلف کے برابر رکھ کر اس نے اپنے فیرو کی ایک ایک نشانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی اور شوکیں میں اس احتیاط سے رکھتا گیا جیسے ہرے زخموں پر سے پٹی اتار رہا ہو۔ اس کی فیسل اس کی نوٹ بکس اس کی کت میں اس کی کارچ اندکان سے کی گولیاں اس کے پتنگ دھاگے کی گنگھیاں چرخ اس کے کپڑے

اس کے شوز، اس کی تصویریں غرض کہ اس کی ایک ایک چیز گنجے مسیح نے اس شوکیس میں سجادی۔

اب ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر رکھنے میں اس کی نوٹ بکس کھول کر اس کی تحریریں پڑھنے میں اس کی تصویریں دیکھنے میں اسے جو سکون ملتا تھا اس کی لذت سے تو وہی واقف ہو گا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گنجے مسیح اپنے زخموں کی کھیتیں ہری کر رہا ہے اور یہ عمل وہ دانستہ کرتا ہے تاکہ چیزوں پر جمع ہوئی گرد و گھاساٹھ ساتھ ساتھ یا دونوں پر جمی ہوئی وقت کی دھول بھی صاف ہو جائے۔

ایک دن وہ اپنے فیرو کی قبر کی تصویر اتار لایا اور اس کی فریم میں لگی ہوئی تصویر کے برابر دوسرے فریم میں جڑ کر اس نے اس کو شوکیس میں رکھ دیا۔

ہر سال فیرو کی قبر پر جو چادر گل چڑھائی جاتی تھی گنجے مسیح برسی کے چوتھے یا پانچویں دن سوکھے ہوئے پھولوں کو قبر پر سے اٹھا لاتا اور اپنے کپڑوں کے بکس میں احتیاط سے رکھ چھوڑتا۔ لیکن وقتاً فوقتاً کپڑے نکالنے اور رکھنے میں جب سوکھے پھول چادر کے تاگوں سے الگ ہونے لگے تو اس نے انھیں بھی احتیاط سے شوکیس میں منتقل کر دیا۔ لیکن اس کے کپڑوں کے تانے بانے میں بسی ہوئی سوکھے پھولوں کی خوشبو سے جب وہ اس طرح محروم ہو گیا تو کچھ دنوں تک وہ پھر اداس اداس رہا۔

ایک دن اس کے دوسرے بچے ندو نے کھیلنے کے لئے کاپڑ اور کانٹے کی چند گولیاں شوکیس سے نکال لیں۔ گنجے مسیح نے جب دیکھا تو وہ بہت بگڑا۔ ساری گولیاں ندو سے چھین، اس کو ڈانٹ پلائی اور گولیاں پھر سے شوکیس

میں محفوظ کر دیں۔

اس کے بعد پھر کسی نے شو کمیس کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ کی۔ آنے جلنے والوں میں کوئی فیرو کی تصویروں کا البم اس کی عدم موجودگی میں دیکھتا تو نہایت احتیاط سے وہیں رکھ دیتا جہاں سے اٹھایا تھا۔

آج صبح ہی سے گھر کا ماحول کچھ اداس سا تھا۔ بچے بالے کھیل رہے تھے لیکن اس کی بیوی اور وہ آپس میں کچھ کہے سنے بغیر اپنے اپنے دلوں میں کوئی مشترک چھپائے ہوئے خاموش تھے۔

فیرو کو جدا ہوئے تیس برس بیت گئے تھے۔ آج اس کی تیسری برسی تھی۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

گنجے مسیح کی چپ ٹوٹ آئی تھی۔ اپنے فیرو کے سامان کو جھاڑ پونچھ کر صاف کرنے کے لئے اس نے شو کمیس کھولا تو فیرو کا کوٹ اور جوتا غائب تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اپنی بیوی کو پکار کر اس نے پوچھا۔

بیوی نے بھیگی پلکیں اٹھا کر کہا۔ میں نے ندو کو پہنا دیا ہے۔ اس کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے اور جوتا پھٹ گیا ہے۔ آپ آج فیرو کی قبر پر جلتے ہوئے ندو کو اس کے اسکول پر چھوڑ دیجئے۔

ماں کے پیچھے سے نکل کر ندو نے گنجے مسیح کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ لباس اس پر سچ رہا تھا۔

کچھ جواب دیتے بغیر ندو کا ہاتھ تھام کر جب گنجے مسیح گھر سے باہر نکل گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ایک ہاتھ کے سہارے کندھے

پر ایک جنازہ اٹھا رکھا ہے اور اس کا دوسرا ہاتھ تھامے زندگی اس کے
ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں۔

موت اور زندگی کئی اس کشاکش میں
گنجلے مسیح اور یسوع مسیح میں کیا فرق ہے ؟
میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا !

جہوں پہ چٹائی

دور ہے پر پہنچ کر اس کا جی چاہا سیدھے راستے پر چل پڑے
 اس کے باوجود بھی کہ وہ طویل تھا لیکن اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ بزدل
 — موت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے جس کا آتا یقینی ہے اور جس وقت اس کو
 آنے ہے وہ آ کر ہے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس کو
 ٹالا بھی جاسکتا ہے۔ وہ چندے تو تف بھی کر سکتی ہے۔ ان کے بس میں
 کیا نہیں ہے۔

لیکن اس کا سائیکل سیدھے راستے پر دو رنگ نکل گیا —
 اس نے سوچا اب بھی واپس لوٹ کر پھر اس راستے پر چل پڑے جو
 اس کی منزل کو قریب تر کر دیتا تھا — لیکن اس کے ذہن میں ایک اور منطقی استدلال
 ابھر آیا — اور وہ سوچنے لگا کہ اس طرح واپس لوٹنا بھی اس بات کی دلیل

ہے کہ اس خیال کو اہمیت دے رہا ہوں جو میرے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ حاوی ہو رہا ہے۔

”اب جبکہ یہاں تک چلے آئے ہیں تو چلو یہی راستہ سہی۔

واپسی میں تو ادھر سے آسکتے ہو۔

دل نے جیسے چوری پکڑ لی۔

اس نے خوف کی پرچھائیل کو پیچھے چھوڑنے کے لئے اتار پر سائیکل تیز کر دی اور ہواؤں میں تسلی کی طرح ڈولنے لگا۔ اس طرح خود اپنے آپ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ تنگ میں ہے اور کوئی خوف اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

واپسی میں — یقیناً ادھر ہی سے آؤں گا۔ اس نے دل ہی دل میں

اس طرح طے کیا جیسے عزم کر رہا ہو — اور سیٹی بج کر سائیکل پر ہواؤں میں ڈولتے ہوئے اس نے خود زندگی کی گود میں ہنکتا ہوا محسوس کیا۔

دفتر سے واپسی پر جب اس کا سائیکل اس کمان کے پاس پہنچ گیا۔ جس

میں داخل ہو جانے سے وہ راستہ شروع ہو جاتا تھا جس پر سے ہو کر گذرنے سے

اس کا گھر نسبتاً بہت قریب پڑتا تھا تو بادل خواستہ وہ اس راستے پر مڑ گیا۔

کاش مجھے یاد نہ آتا کہ میں نے اس راستے سے واپسی کا عزم کیلئے

— یہ خواہش اس کے دل میں تھی لیکن وہ اس خواہش کو مان لینے کے لئے

تیار ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک خوف سا اس کے دل و دماغ کو آہستہ

آہستہ اپنی گرفت میں لیتا جا رہا تھا جس کے آگے سپر ڈال دینا اسے گوارا

نہ تھا۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا تو پھر یہ راستہ اس پر ہمیشہ ہیستہ کیلئے

بند ہو جاتا۔

اس کی نظر میں راستے کے مسدود ہو جانے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔
فرض کیجئے کہ بیچ راستے پر حکومت کوئی بلڈنگ کھڑی کر دینا چاہے
اور اس طرح یہ راستہ بالکل بند ہو جائے تو اس کے گھر اور دفتر کے درمیان خط مستقیم
بنا ہوا تھا تو اس کو حکومت پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کوئی باغی کسان سمٹ روڈ اکھڑ کر اس پر ہل چلائے اور اس طرح بیچ
سڑک پر کھیتی بھلہانے لگے تو بھی اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔
بیچ پوچھتے تو ایسی کوئی تبدیلی اس کے لئے ایک چھپی ہوئی مسرت کا باعث
تھی جس کو وہ علی الاعلان مان لینے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔

جب اس کا سائیکل قبرستان کے روبرو سنگ تراش کی دوکان کے
برابر پہنچ گیا تو اس نے سوچا سنگ تراش کی دوکان کی جانب نگاہ کئے بغیر ہی کیوں نہ گذر
جاؤں۔ پھر خود ہی اس نے اس خیال کی تردید کی کہ یوں چوروں کی طرح نظر اٹھائے
بغیر گذر جانا کسی خوف کی نشان دہی کرتا ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں۔

اس کے ذہن میں ایک جھجھلاہٹ سی اُگئی۔ اتنا سا راستہ میں
نے یہ سوچے بغیر کہ میرے جوانب میں کیا ہے طے کر دیا۔ ادھر ادھر نظر اٹھائی
بھی تو کوئی شے نظروں میں کھب کر تو نہیں رہ گئی اور نہ یوں ہوا کہ کسی خوف
سے نظریں جھکی جھکی رہ گئی ہوں۔ لیکن سنگ تراش کی اس دوکان سے
گذرتے وقت آخر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ آج کتنے دن سے میں اس خیال
سے لڑ رہا ہوں کہ واپس زندگی کو گھٹن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کتنی ہی بار گھر سے

چلتے وقت میں نے طے کیا ہے کہ آج سنگ تراش کی اس دوکان سے اس طرح گزر جاؤں گا جیسے مسافر راستے سے گزر جاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس خیال نے جھجھوڑ دیا کہ سنگ تراش کی دوکان سے گزرنے کے لئے قبل از قبل ذہن کو ہمواد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسافر اس راستے سے اس طرح تو نہیں گزرتے بس گزر جاتے ہیں۔ یہ قبل از قبل سوچ بچار اسی خوف کی بنیاد ہیں جو میرے دل میں جاگزیں ہو رہا ہے۔

لیکن۔۔۔ لیکن میں اس خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا۔ اور اس نے اپنے جوان ارادوں کی شہرہ پاکر بڑی بے اعتنائی سے سنگ تراش کی دوکان کی جانب نظریں اٹھائیں تو ترشا ترشایا قبر کا تعوید جوں کا توں دھڑا تھا۔ اس کے دل پر ایک دھچکا سالگا لیکن اس نے اس دھچکے کو اس طرح محسوس کرنے کی کوشش کی جیسے کسی میلے میں وہ کسی دو ٹیزہ سے ٹکرا گیا ہو لیکن قبر کا تعوید ہر حال دو ٹیزہ نہ بن سکا۔

اس نے قبر کے اس تعوید سے آنکھیں چرا کر سنگ تراش کی دوکان کا جائزہ لیا۔ قبروں کی بندش کیلئے بلا ترشے ہوئے پتھر اور قریب قریب ایک سائز کی کٹی ہوئی چھوٹی اور بڑی پتھر کی کڑیاں اس دوکان کے احاطے میں جو طرف ڈھیروں سے بکھری ہوئی تھیں اور انھیں میں ترشا ترشایا مردانی قبر کا بھادی بھر کم تعوید، زنانہ قبر کے تعوید کے برابر ہی نمایاں طور پر رکھا گیا تھا کہ آسانی سے راہ گیروں کی نظر پڑ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کتنے ہی مسافر اس تعوید کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس بے اعتنائی میں ان مسافروں کا کوئی دوش

نہیں تھا۔ زندگی انھیں فرصت ہی کہاں دیتی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لئے موت کی طرف توجہ دیتے اور اگر سنگ تراش کی اس دوکان سے گذرتے ہوئے عاقبت کا کوئی مبہم سا تصور اُن کے ذہن میں ابھرتا بھی ہوگا تو یہ ایک لمحہ بہتے ہوئے وقت کے سمندر میں مل کر خود اپنی موت آپ مر جاتا ہوگا اور زندگی وقت کا ٹھکانہ نہیں مارتا سمندر بن کر ہر مسافر کے آگے پھیل جاتی ہوگی جس سے بہر حال اس کو پار اترنا ہے۔

لیکن وہ جب پہلی بار اس راستے سے گذرا تھا تو سنگ تراش کی دوکان کے احاطے میں دھرے ہوئے اس بھاری بھر کم پتھر کے تعوید کو دیکھ کر اس کے دل میں اچانک ایک خیال آیا تھا کہ خدا جانے وہ شخص اب کہاں ہوگا اور کون ہوگا جس کی قبر پر یہ تعوید رکھا جائے گا۔ پھر اچانک ہی اس خیال نے کچھ اس طرح کروٹ لی تھی کہ وہ شخص اب یہیں ہے اور وہ خود ہے — اور وہ بوکھلا گیا تھا — کیا بکواس ہے کیسی بزدلی ہے یہ — اگر یوں ہوگا تو یوں ہی ہی — لیکن یوں ہوگا ہی نہیں —

راہ چلتے ایک بخیل تھا جو اس کے ذہن سے یوں گذر گیا تھا جیسے کسی چھوٹے سے ویران پلیٹ فارم سے اکسیریں طرین بغیر ٹھہرے دنداتی گذر جاتی ہے اور پٹریاں کانپتی رہ جاتی ہیں اور اسٹیشن کی بلڈنگ منہ کھولے حیران حیران سی تکتی رہ جاتی ہے۔

اور پھر طرین کے گذر جانے پر اس پلیٹ فارم کی کس میری زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے، ادا سی زیادہ ہی اکھرتی ہے۔

اس کے دل سے بھی دندناتی اکسیریں ٹریں کی طرح ایک خیال گذرا
اور پھر وہی سب کچھ ہو گیا جو اچھڑے پلیٹ فارم پر سے ٹرین کے گذر جانے سے
ہوتا ہے۔

اب روزانہ کا اس کا معمول یہی تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے
لوٹتے ہوئے یا تو وہ خود کو فریب دے کر اس قریبی راستے سے احتراز کرتا جو
قبرستان اور سنگ تراش کی دوکان کے درمیان سے گذرنا تھا یا پھر اپنی اندرونی
اضطرابی کیفیت اور ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا اور اسی راستے
پر چل پڑتا۔ لیکن سنگ تراش کی دوکان کے پاس پہنچ کر اس کی نظریں اسی الجھن
اور بے کلی کے عالم میں سنگ تراش کے احاطے کی جانب اٹھ جاتیں جہاں بھاری بھر کم
تعوید اس طرح دھرا ہوتا جیسے اس کے سینے پر دھرا ہو۔ اور وہ سینے پر اس
کے بوجھ کو کم محسوس کرنے لگتا۔

ایک دن گذرتے گذرتے اس نے جھٹک کر طے کر لیا تھا کہ میں نہ صرف
آج سنگ تراش کے احاطے کی طرف نہیں دیکھوں گا بلکہ مکمل پارچہ دن تک ادھر
نظر ہی نہ اٹھاؤں گا اور اس طرح بھول جاؤں گا کہ کوئی سنگ تراش کی دوکان راہ میں
پڑتی ہے جس کے احاطے میں ایک قبر کا بھاری بھر کم تعوید دھرا ہے جو کسی نہ کسی
مرنے والا کا منتظر ہے۔ اور وہ مرنے والا۔۔۔ اور وہ مرنے والا۔۔۔
اور وہ مرنے والا۔۔۔ میں میں میں۔۔۔ اور وہ نظریں اٹھائے بغیر سنگ تراش
کے احاطے کے برابر سے گذر گیا۔ شام جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو کوکان
میں مڑتے ہی اسے خیال آ گیا کہ اس سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظریں

اٹھائے بنا ہی گذر جانے سے سوچ کر اس نے ایسا ہی کیا۔

اب تو تین روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس نے روزانہ دوبار کے حساب سے چھ وقت اسی راستے سے گزرنے کے باوجود سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر نہ اٹھائی تھی۔ چوتھے دن اس راہ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب در دیدہ نگاہوں سے احاطے کی طرف دیکھ لے۔ شاید وہ بھاری بھر کم تعویذ نہ رہا ہو۔ شاید کسی نے کسی بد نصیب کے لئے اسے خرید لیا ہو۔ لیکن پھر وہ اپنے پرتا بوبالیتا یا دکر تاکہ اس نے مکمل پانچ دن اس سمت نظر نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کو الجھن سی ہونے لگتی۔ جب وہ فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اس کا دل اس احاطے کی طرف مائل ہی کیوں ہے۔ پھر وہ اپنے ہی استعمال کے ہوئے الفاظ کی اصلاح کرتا۔ مائل ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو خائف ہے اور اسی خوف نے ازالے کے لئے وہ ادھر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اس بات کا معترف ہو چکا ہے کہ وہ قبر کے اس بھاری بھر کم تعویذ سے خوف کھاتا ہے۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کل کا ایک ہی دن تو باقی ہے۔ برسوں میں احاطے کی طرف دیکھوں گا۔ اور اگر تعویذ جوں کا توں دھرا ہے تو تو کیا۔ دھرا ہے گا۔ میرا کمالے جائے گا۔ میں بھی پھر دس دن تک ادھر نظر نہ اٹھاؤں گا۔ اور وہ نظریں نیچی کئے تیز تیز سائیکل دوڑاتا قبرستان اور سنگ تراش کے احاطے کے درمیان سے گذر گیا۔

پانچواں دن تو گویا اس کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہا تھا۔ دفتر جلتے ہوئے جب وہ اس راستے پر پڑا تو اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بھاری بھر کم تعویذ نہیں رہا۔ یقین ہو گیا تھا۔ وہ یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ کتنے ہی لوگ مرتے ہوں گے۔ پھر کسی نہ کسی کے لئے کسی نہ کسی نے یہ پتھر ضرور خرید لیا ہو گا۔

نہیں بھی خرید سکتا ہے۔۔۔ پر ایسا سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔ لیکن اس نے سائیکل پر ڈولتے ہوئے تیز تیز پیڈل مار کر جھوٹی ترنگ اپنے میں اس طرح پیدا کر جیسے نہیں سے مستعار لی ہے۔

شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو اس کو کسی کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں اور جانا پڑا اور اس طرح وہ اس راستے سے واپس نہ ہو سکا۔ لیکن جب گھر پہنچا تو اس کے ذہن میں وہ کہہ کر اس بھاری بھر کم تعویذ کا تصور ابھر رہا تھا۔۔۔ اے گرو! اے سدا ہر ادھر کی باتیں کیں۔ اپنے بچوں کو لے کر سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گیا۔ انہیں سوسائٹس دلائے۔ خود بڑھیا سگریٹ خرید کر خطا اٹھانے کی کوشش لیکن کوئی پہلا نہ بھی اس کو اس بھاری بھر کم تعویذ کے خیال سے چھٹکے یا نہ دلا سکا۔ رات رات اٹھتا رہا بھاری بھر کم سا پتھر تھا۔ جس کا بوجھ اپنے سینے پر وقفے وقفے سے دیر رات اس نے خواب بیکھا کہ سنگ تراش کے احاطے میں ایک چھوٹا سا نیپتہ اور مردوں، عورتوں اور بچوں کی کئی مورتیاں ادھر ادھر کھڑی ہوتی ہیں۔ جن کے چہرے سنہ ہیں لیکن پتھروں کے وہ انبار ہیں نہ وہ بھاری بھر کم پتھر کے تعویذ۔۔۔ ۲۱۔ سنگ تراش کے احاطے کا یہ پراسرار ماحول کچھ اتنا ناگوار کہ رات کو اٹھ کر

آیا جو وہ پہلے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن یکا یک جب اس کی نظر اپنے ہی مجسمے پر پڑی تو وہ کھٹک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا مجسمہ بالکل تازہ تازہ تراشا گیا ہے اور اتنا سخی نہیں ہے جتنے دوسرے مجسمے ہیں۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بیدار ہو گیا۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو بستر پر پا کر اسے سکون ہوا لیکن جوں جوں اس خواب کی مبہم تصویریں اس کے ذہن میں ابھرتی گئیں وہ کچھ مضطرب سا ہوتا گیا اور اسی اضطراب کے عالم میں کئی بار اس نے بھاری بھر کم پتھر کے تعویذ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ اسے پھر گہری نیند نہ آئی۔ صبح تک وہ غنودگی بیداری اور نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں جھل رہی تھیں۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا اور اعضاء میں اضمحلال سا۔ اس نے نہادھو کر کچھ فرحت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے وہ تازگی نصیب نہ ہوئی جو وہ ہر روز نہادھو کر محسوس کرتا تھا۔ اس نے چائے کی بجائے کافی خاص طور پر بنوا کر پی۔ روز کی طرح اس سے ناشتہ بھی کیا نہ گیا۔ انڈے والے کی آواز سن کر اس نے اسے بلایا۔ اپنے لئے ایک انڈا خریدا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کس طرح انڈا کھا سکتا ہے۔ اس نے سارے گھر کے لئے ایک ایک انڈا خریدا۔ حالانکہ کئی بار وہ تنہا انڈا کھا چکا تھا۔ نیم برشتہ انڈے میں بھی اُسے وہ لذت کام و دہن نہ ملی جس سے وہ آشنا تھا۔ وہ انڈے کو دو اک گولی کی طرح نگل گیا اور گھڑی کی طرف نظر اٹھا کر اس طرح دیکھا جیسے پھر دیکھنے کی تمنا ہو اور بوجھل بوجھل تدم اٹھاتا آنکھوں میں دھڑے سائیکل تک پہنچا۔ سہمائی دارتفل میں کبھی لگا کر جب اس نے پچھلے پیہرے کی زنجیر کھولنی چاہی تو وہ فوراً نہ کھلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج یہ تفل نہ کھلے تو وہ اسی بہانے دفتر نہ جائے گا۔ میرے وہ چاہتا تو دفتر نہ جاتا۔ اسے رخصت کا حق تھا اور

بھلا گھر میں اسے کون ٹوک سکتا تھا۔ لیکن وہ تو آج دفتر نہ جانے کے لئے بھی کسی نہ کسی جواز کا متلاشی تھا۔۔۔ قفل کھل گیا اور سائیکل باہر نکال کر وہ بادل ناخواستہ دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

آج جانے کیا بات تھی کہ پتھر کا تعویذ بار بار اس کے تصور میں پھیر رہا تھا بات کیا ہوگی۔ یہی ہوگی کہ پانچ دن گزر گئے تھے اور آج پچھا دن تھا اور آج وہ سنگتراش کے احاطے کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کا اپنے ہی معاہدہ کی رُو سے مجنا نہ تھا۔ وہ جوں جوں سنگ تراش کے احاطے کے قریب ہوتا جاتا اسے اپنی نمبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتیں اس نے پوری قوت کے ساتھ عقلی دلائل سے اپنے اس دہسے پر بھر پور وار کیا۔ کیا یہ انسانی عقل کا دیوالیہ نہیں ہے کہ ایک پتھر نے مجھے اتنا خائف اور ہراساں کر دیا ہے۔ کیا یہ رب العزت اور معبود حقیقی کی توہین نہیں ہے کہ میں موت کے ایک متعینہ وقت پر ایقان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کیسی بزدلی ہے جس کا میں شکاں ہو گیا ہوں۔ میں اپنے ان توہمات کی داستان بھی تو کسی کو نہیں سنا سکتا۔ میرے ہمدرد خود مجھ پر ہنسیں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ اور اس نے جھر جھری سہک اپنے کچھ کچھ اس طرح صاف کر دینے کا کوشش کی جیسے سلیٹ پر بھینکا ہوا کپڑا پھیر کر حرف مٹائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے دل نے جیسے آگے بڑھ کر سہا دی کی۔ اپنا دکھ درد لوگوں سے کہہ دو۔ لوگ ہنسیں گے مذاق اڑائیں گے تو شاید ان کے اسی رویے سے تمہیں تقویت پہنچ سکے اور یہ بوجھ تمہارے ذہن سے ہٹ سکے۔ یہ پتھر تمہارے سینے پر سے سرک جڑے۔ لیکن اس نے دل کے ہاتھوں شکست تسلیم نہیں کی۔ اپنے ذہن کو نئی دلیلوں سے اس طرح تیار کیا جیسے خود مدافعت کیلئے مسلح ہو رہا ہو۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے سیدھے گزر جانے پر وہ سنگ تراش کے احاطے کو چھوڑ بھی سکتا تھا تو اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی موٹر سن کر کے اس کے برابر سے گزر گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ سائیکل پر سے اتر پڑے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سنگ تراش کے احاطے اور قبرستان کے درمیانی راستے سے بہت اطمینان اور سنجیدگی سے گزر جانے کی سعی نامشکوہ کرے۔ لیکن پھر اس کے دل نے ہی تردید کی۔

”ساداراستہ کیا پیدل طے کر کے آئے ہو“

”نہیں“

”تو پھر یہاں یہ خصوصیت کیوں برت رہے ہو۔۔۔ چلو۔۔۔ چلتے رہو۔۔۔“
 رکو مت۔۔۔ اور وہ سائیکل کے پیڈل گھماتا رہا۔ لیکن اس کی رفتار جانے کیوں سست ہو گئی تھی۔

جب وہ قریب پہنچ گیا تو اس نے ایک عزم صمیم کے ساتھ نظر اٹھائی تو قبرستان میں پھیلی ہوئی نئی پرانی قبروں پر دھوپ پھیل رہی تھی اور کتبوں کے سائے لمبے لمبے تھے۔ اور جب دوسری سمت سنگ تراش کے احاطے کی جانب اس نے نظر اٹھانے کی ہمت کی تو مردانی قبر کا بھاری بھر کم تعویذ جوں کا توں دھرا تھا لیکن اسکے پہلو سے زنائی قبر کا تعویذ غائب تھا جس کو وہ فوری محسوس بھی نہ کر سکا۔ لیکن پھر اسے خیال آ ہی گیا کہ یہاں کچھ اور بھی تھا۔

اداسیوں نے جیسے چاروں طرف سے اس پر یلغار کر دیا تھا۔ اس کا عالم یہ تھا جیسے اسے کوئی نکلے لگانے کو وہ نہ پڑے گا لیکن وہاں قبر کے بھاری بھر کم

تعویذ کے سوا اس کا اپنا تھا بھی کون۔ کسی راہ رو کو اس کی دلی کیفیات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لہذا وہ بغیر روئے ہی ایک بوجھ سا اپنے دل و دماغ پر اٹھائے چپکے سے آفس پہنچ گیا اور اتنا اُداس رہا کہ دوپہر کو انڈول میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ اس نے کھانا کھایا نہ بات ہی کی۔ اس نے دل ہی دل میں غمخس کیا کہ پانچ دن تک اس جانب نظر نہ اٹھانے کا نتیجہ کر کے اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ ان پانچ دنوں سے اس نے خیر اُردی اور غیر شعوری طور پر کچھ ایسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں کہ چھٹے دن پتھر کے غمخس تعویذ کو نہ دکھلانے کا اس کی آنکھوں نے جیسے اس سے وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن آج انھیں آنکھوں نے پھر وہی تعویذ دکھلایا تھا۔ اس کو لمحے بھر کے لئے اندھوں کی قسمت پر رشک آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنا یہ خیال بڑا منہکہ نیز معلوم ہوا۔ ساتھ ہی کچھ دیر بعد اس کو یہ خواہش ضرور ہوئی کہ میں نے دنیا تو دیکھ لی ہے۔ چاند ستارے سورج، جھاڑ، پہاڑ، آگ، پانی، بادل، ہوا، زمین، آسمان، پھول پھل، بیوی بچے اور اس کے بعد اگر میں اندھا ہو جاتا تو میری بقیہ زندگی قبر کے اس تعویذ کو دیکھے بغیر ہی سکھ چین اور آرام و خوشی سے گزر جاتی اور اس کو اپنے بیٹا ہونے پر دکھ سا ہوا۔

آفس ختم کر کے جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے قریب قریب اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ وہ اس طرح سوچنے لگا تھا کہ اس کو یک لخت اس راستے سے آمد و رفت بند کر دینی چاہیے۔ ایک عجیب سا تنہائی کا احساس اس کے وجود کو دنیا کی چہل پہل سے اس طرح جدا کر رہا تھا۔ جیسے دنیا دنیا نہ ہو ایک وسیع و عریض قبرستان ہو جس میں دھری ہوئی اپنی میت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

خدا نہ کرو۔ اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔ اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دو۔ کچھ ہی دن میں تم بھول جاؤ گے کہ وہاں کوئی قبرستان ہے جس کے سامنے رہی سنگ تراشی کی دوکان ہے اور اس دوکان کے احاطے میں پتھر کا ایک بھاری بھر کم تعوید ہے جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے لیکن عقل نے پھر دلیلوں کا سہارا لیا۔ تم تو بڑھے لکھے آدمی ہو اور اس بات پر تیار ہو چکے ہو کہ اب تم بزدلوں کی سی زندگی گزارو گے۔ ایک واہمہ جب اس دل میں جا گزیں ہوتا ہے تو ہزار واہمے دامن دل تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ تم نے کاش اس عالم حاصل نہ کیا ہوتا۔ اپنی ساری کتاہیں جلا دو۔ علم کی توہین انسان کی توہین ہے اور انسان رب العزت کا نمائندہ خصوصی ہے اور تم —

”چلو میں بھی شہر چلی رہا ہوں“ اس کے دوست نے پیچھے سے گدھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ چونک پڑا جیسے سینے پر پتھر کا تعوید آگیا ہو۔

منٹ بھر میں اس نے اپنے حق اس درست کئے اور دوست کا ساتھ اس کے لئے بہت اور طاقت بن گیا لیکن یہ طاقت بھی زیادہ دیر اس کی اپنی ہو کر نہ رہ سکی جب وہ اس موٹر پر پہنچے جہاں کمان میں سے ہو کر انھیں اسی قریبی راستے سے گزرنا ہوتا تھا تو اس کے دوست نے اپنی سائیکل اسی سمت یہ کہتے ہوئے گھمائی کہ ”آؤ تمہیں ایک قریبی راستے سے لے چلوں شاید تم واقف ہی نہ ہو“ تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے اپنی سائیکل بھی اسی سمت موڑ لی۔

اس کا دوست دنیا بھر کی باتیں کر رہا تھا اور وہ ہوں ہاں کئے جا رہا تھا مگر وہ پوچھ بیٹھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تب بھی وہ اسی طرح ہوں ہاں کر دیتا جیسے

دوست کی کسی بات سے اتفاق کر رہا ہو۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اپنے ساتھی کو روک کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور اس کے سینے پر سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لے جو اس کی آنکھوں کے راستے بہہ جانے کے لئے ٹکڑا کھڑا تھا اور اس سے کہہ دے کہ آؤ ہم اس تعویذ کو اٹھا کر کسی دریا میں پھینک آئیں تاکہ میں — تاکہ میں کچھ اور زندہ رہ سکوں — وہ یہی سوچتا ہوا جب سنگ تراش کے احاطے کے قریب پہنچا تو اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس نے اتنا راستہ طے کر لیا ہے — وہ اپنے ساتھی سے تو کچھ نہ کہہ سکا — خود اپنے آپ سے اس نے اتنا کہا کہ اب میں کبھی اس راستے نہ آؤں گا اور جب آخری بار دیدہ نگاہوں سے اس نے احاطے کی طرف نظر کی —

آں — اس کی زبان سے اس طرح نکلا کہ اس کے ساتھی نے بھی اس کی آواز سن لی۔

”کیا بات ہے —“ اس کے ساتھی نے پوچھا۔

لیکن کچھ جواب دیتے بغیر ایک لگا کر اضطرابی کیفیت میں وہ اپنی

سائیکل سے کود پڑا۔

سنگ تراش کے احاطے میں مردانی قبر کا وہ بھادی بھر کم تعویذ موجود تھا۔

تم جاؤ — میں ذرا یہاں ٹھہروں گا — مجھے کچھ کام ہے“ اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ساتھی نے بخود اس کو دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر چلا گیا تو اس نے

سنگ تراش کے احاطے کا رخ کیا۔

جب وہ اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا اچھوٹی سی پتھر ملی حصار کے قریب پہنچا تو اس کے دوست نے باہر نکلتے ہوئے اس کو پوچھا۔
”خیریت تو ہے؟“

ہاں بھئی اللہ کا احسان ہے۔ اس نے اس نوار کو ہچچاٹتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اسے بھی خیریت پوچھنی چاہیے جبکہ اس کا دوست سنگ تراش کے احاطے سے نکل رہا تھا، اس نے فوری سوال کیا۔

”کیا بات ہے؟ سب خیریت سے تو ہیں نا۔ تم اس احاطے میں کہاں گئے تھے۔“

اس کا دوست کچھ کہے سُننے بغیر اس کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے من کی بانہم کیڑ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کچھ تو بتاؤ۔ تم اتنے دل گیر کیوں ہو؟“

اس کے دوست نے رک کر نظریں اٹھائیں تو وہ ابدیدہ تھا۔ کچھ ترقف کر کے جب وہ اپنے جذبات پر قابو پاسکا تو اس نے کہا ”میا صفت کر لیا۔“

”کب؟“

”آج یا بجواں دن ہے۔ آج ہم نے اس کی قبر بچتہ بنوا دی ہے۔“

”کیسا کڑیل جوان تھا یا نہ؟“ اس نے افسوس کرتے ہوئے اس طرح کہا
”خود اپنی ہی آواز نہیں پہچان رہا ہو۔“

اس کے دوست نے مجھ بٹھل کر پھر کہنا شروع کیا ”آج فائنل ہے۔“

میں اس کی قبر پر ہی جا رہا ہوں۔ آج ہم نے اس کی قبر کا تعویذ یہیں سے خریدا تھا اور اب کتبہ دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن کوئی اچھا کتبہ یہاں نہیں ہے۔“
 ”چلو میں بھی چلتا ہوں۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
 جب وہ قبر پر پہنچے تو کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

ہاتھ اٹھا کر جب وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا تو اس کے سامنے ہی مردانی قبر کا وہ بھاری بھر کم تعویذ چھوٹوں سے ڈھکا ہوا، ابدیدہ انسانوں کے درمیان دھرا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھر رہا تھا کہ وہ آخری بار اس تعویذ کو دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

لیکن اس پر کوئی یہ تہمت کیسے لگا سکتا تھا کہ اس کے یہ آنسو صرف غم و اندوہ کا اظہار نہیں ہیں بلکہ کسی ڈھکی چھپی خوشی کا سبب بھی ہیں۔

زمین کا درد

میں جب قبرستان میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت شام کے دھندلوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں رات کے اندھیروں کو سوپ دی تھیں۔ رات بے باؤں میرے دل کی اداسیوں کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کیا چاہتی تھی اس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ میری ہر لحظہ بڑھتی ہوئی اداسیاں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ میری جیب میں دہسکی کی آدھی بوتل تھی جو آدھی سے کچھ زیادہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے کبھی بھی ایسا محسوس ہوا کہ حالات کا زہر پی کر زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا انسان شراب کا سہارا لے کر بھی پکھٹاتا ہے۔ آج پھر میں کچھ اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ دہسکی کی آدھی بوتل نے مجھے مسحور تو کیا ہے۔ لیکن زندگی کے اس زہر کو جو میری نس نس میں سرایت کر گیا ہے۔ میں بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ انسان جس کی مجبوری پر مجھے ہنسی آتی تھی۔ آج اس کے ہنسنے پر مجھے مجبوری کا گمان ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔

زندگی کے اس سفر میں میں اکیلا تو نہیں ہوں کہتے ہوں گے جو اخبار میں آدمی کے خلاف
تیرنے کی خبر پڑھ کر ان خلاؤں کے متعلق سوچتے ہوں گے جو اسی زمین پر ان کے اطراف
پھیلے ہوئے ہیں اور چاند تک پہنچنے والا آدمی ان کا سینہ چیرنے کی دسترس نہیں
رکھتا۔

میں جب اپنے ٹیبل پر بیٹھا ہوں تو اس وقت تک ایک لفظ بھی مجھ سے
لکھا نہیں جاتا۔ جب تک میں شیشے پر اٹی ہوئی گرد کو کپڑے سے صاف نہ کر لوں۔ اور
جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ جان کر بھی مسکرا نہیں سکتا میرے دل پر گرد کی جوتھیں
بم لگی ہیں ان کو صاف کر کے چمکا دینا میرے ہونٹوں کی کسی مسکراہٹ کے بس میں نہیں
ہے۔ میں باہر کی گرد جھاڑ دیتا ہوں، اندر کی گرد کو زبردراہ سمجھ کر چل پڑتا ہوں۔

میں قبرستان سے ایک ہی جہت میں آپ کو اپنی لکھنے کی میز تک۔ لے آیا
ہوں۔ لیکن مجھے قبرستان سے لکھنے کی میز تک ایک قدم کا فاصلہ بھی محسوس نہیں ہوا ہے
حقیقت کے اس اظہار کو اگر آپ زندگی سے فراہم کا نام دیتے ہوں تو مجھے خود پر نہیں
آپ پر رحم آتا ہے کہ آپ سچ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

چلنے میں پھر آپ کو قبرستان لئے چلتا ہوں۔ میں جس وقت یہاں پہنچا
تھا تو میں نے اپنے بیٹے کی قبر کے پائینتی سر جھکا کر بیٹھ بیٹھ پیسے کی آخری صدا
سنی تھی۔ میری آنکھوں اور قبرستان کے درمیان ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کی ایک
چلمن سی حامل ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے سینے پر پھیلے ہوئے سفید
بال دیکھ سکتا تھا جو میری شرٹ کا بٹن کھل جانے سے مجھے نظر آ رہے تھے۔

میرا بیٹا قبر میں سو رہا ہے۔ شام ڈوب رہی ہے پیپا جانے کس کو

پکا رہا تھا اور ایسے میں آنسوؤں کی چلیں سے میں قبر کو بھی دیکھتا ہوں اور اپنے سینے کے سفید بالوں کو بھی۔ لیکن کیا آج کی زندگی جینے والوں کے لئے یہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہے ؟

اگر یہی سب کچھ ہوتا تو مجھ پر دھکی کی آدھی بوتل اپنا اثر نہ کرتی؟ میں اس کی قبر سے چپٹ کر چھوٹ چھوٹ کر نہ رو لیتا؟ — میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اتنے آنسوئیں کہ میں انھیں فراخ دلی سے بہا سکوں۔ لیکن اتنے آنسوئیں کہاں سے لالوں۔ چاند تک پہنچنے والا آدمی اتنا عظیم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس آنسوؤں کا در نہ نہیں رہا ہے۔ اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر چھوٹ حسین ہوتا ہے۔

کہانی شاید اس طرح نہیں بنتی جس طرح میں آپ کو سننا چاہتا ہوں۔ کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے۔ جیسے جاگتے آدمی کے سانس کی طرح مسلسل۔ بس یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں۔ میں یہ سارے گھر جانتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو اکھڑی اکھڑی سانسوں کی کہانی سننا چاہتا ہوں تو کہانی کا کیا ہو گا۔ پھر بھی میں اکھڑی اکھڑی سانسوں کو جوڑ کر انھیں مسلسل اور مربوط بنا کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے اپنی سیاہ زلفیں زمین کے شانے پر پھیلا دیں تو زمین کی ساری ہنگامہ آڑیاں چین کی نیند سو گئیں۔ اور یہ تو قبرستان تھا جہاں میں تھا۔ یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی کہ کوئی سونے والا جاگ پڑے گا اور اس کے زخم ہر سے ہوں گے۔

میں سگریٹ جلا کر اس کی قبر کے پائنتی بیٹھ گیا ہوں۔ جس چہرے پر پھولوں کا سہرا دیکھنے کی تمنا تھی اس کو میں نے منوں مٹی کے نیچے چھپا کر پالش کئے ہوئے پتھر سے ڈھک دیا ہے اور اب یہی پتھر مجھے پیار ہے، میں جن پر مٹی پھول بکھر دیے ہیں اگر بتیاں جلا کر سر ہانے رکھ دی ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں۔

تاریکی بڑھنے لگی تو سناٹے اور شدید ہو گئے شہر خوشامی مردوں کا شہر نہیں رہتا اگر آپ کو اس شہر کا ایک باسی بھی پایا ہو اور میں جس کی قبر کے پائنتی بیٹھا ہوں وہ تو مجھے بہت پیارا تھا۔ میں نے موم بتیاں جلا کر طیر کی مٹریوں میں رکھ دی ہیں۔ میرے چاروں طرف اُجالے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کے سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے کتبوں سے چمٹنے کے لئے چلے آئے ہیں۔ اندھیرے میں سائے بھی ساتھ نہیں رہتے۔

یہ قبرستان بہت وسیع ہے۔ یوں سمجھئے اب میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں میرے چاروں طرف قبریں بکھری ہوئی ہیں، چھوٹی بڑی، نئی پرانی، بہت پرانی۔ میرے پشت پر چوتھرے کے احاطے کی دیوار سے پرے ایک مکان ہے۔ یہ مکان آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا ہے۔ اور ایک بہت بڑی قبر کے مانند لگتا ہے۔ جس میں کئی لوگ زندہ دفن ہیں اس مکان اور محصور چوتھرے کے درمیان جس پر میں ہوں آنے جانے والوں کے لئے راستہ چھوڑ کر زمین کا چپہ چپہ استعمال کیا گیا ہے اور جو بچ رہا ہے وہ مرنے والوں کا منتظر ہے۔

دوشنی کے اس دھتے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلائے تھے میرے اطراف پھیل گیا ہے۔ میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔

صبح پر چھٹے توجہ میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اجالوں سے ڈر لگتا ہے اور یہ ڈر مجھے اپنے اطراف پھیلی ہوئی موت سے نہیں لگتا بلکہ اس زندگی سے لگتا ہے جو کھنڈر بنتے ہوئے مکان میں۔ سے مجھے تاقتی ہے۔ میرے بیٹے کی قبر کے اطراف اجالا دیکھ کر اس گھر میں رہنے والے یہ جان جلتے ہیں کہ میں آگیا ہوں۔ پھر اس گھر میں سے ایک ماں نکلتی ہے جو راستہ ڈھونڈھتی ہوئی قبروں قبروں ہی پر پیر نکلتی ہوئی ہے پاؤں محصور احاطے تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں میں اس کی آمد سے بے خبر بیٹھا ہوں۔ وہ بہت آہستہ چھوٹا سا نکرطی کا گیٹ کھول کر بتی کی طرح داخل ہوتی ہے۔ بھڑ بھڑاتی داخلے سے روکنے کے لئے جو گیٹ ڈالیا گیا ہے اسی گیٹ سے ہو کر یہ بھی احاطے میں میرے قریب تک چلی آئی ہے۔ میں اگر تدموں کی چاپ نہیں سن پاتا ہوں اور اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا ہوں تو وہ کچھ دیر کھڑی رہتی ہے۔

پھر مجھ سے کہتی ہے۔

اٹھو — جس کی امانت تھی اُس نے تم سے چھین لی ہے۔

اور میرے دل پر ایک مکا سا لگتا ہے — میں اس کو ایسی لگا ہوں سے دیکھتا ہوں جیسے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں کہ وہ مجھے میری تنہائیاں دے دے۔ مجھے اس جگہ اکیلا چھوڑ دے تاکہ میں جب تک جی چاہے چاپ بیٹھا رہوں۔ پھر چلا جاؤں لیکن کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے والی نوجوان لڑکیوں کی یہ ماں دراصل ہندستان بھر کی ماؤں کی روح معلوم ہوتی ہے اور میں غم سوس کرتا ہوں کہ میں عالم ادواح میں پہنچ گیا ہوں۔ اور یہ اُداس اور مستابو چہرہ جو میرے مقابل ہے دراصل ایک روح ہے ایک ایسی ماں کی روح جس کی چھ لڑکیاں جوان ہیں امدان جوانوں کو دفنانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مجھ سے دو چار اُلٹی سیڑھی تہیوں کی باتیں کر کے وہ اپنی رام کہانی لے بیٹھتی ہے۔ زیچ بیچ میں مجھے نصیحت بھی کرتی جاتی ہے کہ میں غم نہ کروں۔ یوں کر نا شاید اس لئے وہ ضروری سمجھتی ہے کہ مجھے احساس دلاتی ہے کہ اس کے دل میں میرے لئے ہمدردی ہے۔ حالانکہ وہ خود ہمدردیاں بٹورنے چلی آئی ہے۔

بی جان بی کا زردوزی کا دوپٹہ پرسوں میں نے اونے پونے بیچ دیا۔ اس کی شادی کے لئے کب سے اٹھا رکھا تھا۔ جب میں نے دوکان دار کے پیر پچھ لئے کہ چھ پہاڑ سینے پر دھرے ہیں۔ انھیں بھوکوں مارنا مجھ سے ممکن ہوتا تو میں بھی کسی قبر میں چین کی نیند سو جاتی۔ جیسے میں اب مزہ نہیں، اذیت ہے لیکن یہ اذیت میں انھیں لڑائیوں کے لئے برداشت کرتی ہوں ورنہ زندگی سے جی اوب گیا ہے۔ میاں۔ یہ لوگ اچھے ہیں جو چین کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ قبرستان کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ اب ٹل جائے۔ میں اس کی بکواس سے تنگ آ گیا ہوں مجھے اپنی تنہائی کے لٹنے کا غم ہے۔ اور یہ عالم ارواح کی ماں جو قبروں پر پاؤں رکھ کر بے جے میرے پیچھے چلی آئی ہے۔ اپنے سینے پر چھ پہاڑوں کا بوجھ لئے میسر اسیہ بن گئی ہے۔ وہ پھر کہنے لگی ہے کہ — کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیل چھڑک کر سب کو جلا ڈالوں اور خود بھی جل مروں۔ کتنے ہی خاندان تنگ آ کر جب ایسا کچھ کرتے ہیں تو ان کی بے دردی پر الجھن ہوتی ہے۔ سوچتی ہوں اُن کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہوں گے۔ لیکن جو روز زندہ رہنے کی کوشش میں گذرتے ہیں تو اپنی ہی مجبوریاں ہم سے کہتی ہیں کہ پتھر تو تمہارے سینوں میں ہیں جو ایسی زندگی جی رہے ہو۔

میں اُٹھتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ آداب سلام

کہا پیسہ مانگنے کے لئے آسایا۔

اب میری آنکھیں اندھروں سے اتنی مانوس ہو گئی ہیں کہ دور تک دیکھ سکتی ہیں لیکن جہاں دیکھنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں قبریں ہیں جہاں میں نہیں دیکھ سکتا ہوں وہاں بھی قبریں ہیں جو دن کے اجلاس میں مجھے نظر آتی تھیں اور اب آنکھوں سے اوجھل ہیں پاس ہی بڑھے املی کے مدخت کے نیچے ایک جگنو جھٹک رہا ہے۔ کوئی مسافر یہاں ہوتا تو اس جگنو کی روشنی میں بھی راستہ پانے کی سوچ سکتا تھا لیکن یہاں تو سارے مسافر تھک کر سو گئے ہیں اور ایراسو کہیں کہ انھیں نہ سورج کی کرنیں جگنا سکتی ہیں نہ بارش کی بوندیں۔ ایسے میں یہاں جگنو کا وجود بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔

کسی قبر پر کوئی چراغ نہیں ہے۔ چراغ خود بخود بھی تو نہیں جلتے۔ اب زندگی کو اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ موت کے راستوں میں چراغاں کرتی پھرے۔

میں خود بھی تو ہمنیوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔ جس شخص کا چہرہ دن میں دس بار دیکھے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ اس کی قبر کی طرف ہمنیوں میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ہے یہ سوچ کر جی کشت اداس ہو جاتا ہے کہ کل ہم بھی وہوں سے حرف غلط کی طرح نحو ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے جب اپنے معمول کے خلاف میں پندرہ بیس دن کی تاخیر سے قبرستان کو گیا تو مجھ سے اسی پاگل ماں کی روح نے کہا تھا۔

”اس وقت تم یہاں کیسے آ سکتے ہو۔ اس وقت تو تمہیں

غلط کیسے کہہ میں ہونا چاہیے تھا“ — اور اس سے

پہلے کہ اس سے میں کچھ کہتا۔ اس نے خود جواب گھر دیا

— تم اسی لئے اتنے دن نہیں آئے ہو —
 کیوں ہے نا۔

جب یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت اندھیرے بھی نہیں تھے جو مجھے
 چھپا لیتے سورج ابھی نکلنا تھا۔ نکلنے کے لئے سنور رہا تھا۔ وہ اطمینان سے میری
 پشت پر احاطے کی دیوار تک چلی آئی تھی۔

آج ہمسینوں بعد میں یہاں آیا ہوں تو میں نے خود جلائی ہوئی موم بتیاں
 پھونک مار کر بھادی ہیں۔ لیکن اس وقت جب موم بتیوں کے شعلے لرز کر بجھنے والے تھے۔
 میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھول دیکھے، مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ دراصل
 یہ میری بھول تھی۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں نے ہی پھول چڑھائے ہیں۔ لیکن جب میری
 آنکھیں اندھیروں سے مانوس ہوئیں اد جب میں نے گنبد کے سرے دروازے کو بند
 دیکھا تو اس دروازے کی دراز سے مجھے اپنا سرکش بچپن جھانکتا ہوا نظر آیا۔ جو
 نانا حضرت سے پیسہ مانگنے کی امانت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکا
 تھا اور جب ان یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر میرا ذہن اپنے بیٹے
 کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ جلانے کے لئے کتبے کی اوٹ میں چھپ
 کر اس احتیاط سے تیلی جلائی کہ لمحہ بھر کو پھیلنے والی یہ روشنی بھی کھنڈر ہوتے ہوئے
 مکان میں رہنے والی لپٹی اں کی نظروں سے چھپی ہے۔ لیکن میری آنکھوں نے ایک
 عجیب منظر دیکھا — مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ میں
 جو کچھ دیکھ رہا تھا سچ تھا — وہ کون ہے؟ — وہ کون ہے جو میرے
 غم میں شریک ہو گیا ہے۔ وہ پھول جو میں قبر پر چڑھانے کے لئے لایا تھا وہ

تو پیل کے بھیگے ہوئے پتوں میں محفوظ تھے۔ ان پر لیٹا ہوتا گاٹک جوں کا توں تھا۔ پھر تازہ پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کر لئے۔ میری انگلیوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک محسوس کی۔ ہمیں سورج کی کرنوں نے نہیں چھوا ہے۔ نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے کہہ رہے تھے۔ میں نے انھیں قبر پر اس احتیاط سے رکھ دیا۔ جیسے پلکوں میں آنسو پرور رہا ہوں۔

جی چاہا موم بتیاں جلا کر اس نگلی ہاں کا انتظار کروں جو روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ کے بغیر میسر نہ پہنچے جلی آئی ہے۔ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر موم بتیاں جلا دیں تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پالش کئے ہوئے پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑ رکھے ہیں۔ میں نے انھیں چومنا چاہا تو میرا سایہ قبر پر ڈول گیا۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ دھمکی کی بوتل سے کڑوے سے گھونٹ لئے۔ پھر مگر بیٹ کے لمبے لمبے کش رے کر اس طرح چپکا سا بیٹھ رہا جیسے قبروں سے سانسوں کی آواز سن رہا ہوں۔

پاس کے اجلے نے حضور کے اندھیرے کو اوندھ گہرا کر دیا تھا۔ نیم کے بورڈ درخت کی بلند نیل کو اب ایک نہیں کی جگنو چھو رہے تھے۔ یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی بچھا دیا جائے تو بے فائدہ۔ یہاں جگنو کی چمک موم بتی کے اجالے مقبول کی بجائے کچھ بھی دلوں کے اندھیروں کو فز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں ہے۔ لیکن وہ کون ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بورڈ نیم کے گھنے اندھیرے میں۔

میں کھڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے بغور دیکھا ہے۔ لیکن کوئی۔

ہے۔

میں آہستہ آہستہ احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پر نظر ڈالی۔ موم بتی کی روشنی میں بھی اس کے کتبے پر کندہ اس کا نام، اس کی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں، بڑھ سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اس عبارت کی سیاہی مٹ گئی ہے۔ میں کچھ اور دکھی ہو گیا ہوں۔ کسی کتبے کے حروف مٹ گئے ہوں تو سمجھو کہ اس کے رونے والے کے دل سے اس کی یاد مٹ رہی ہے۔

میں سر جھٹکائے احاطے کی دیوار سے لگا ہوا بے پاؤں بوڑھے املی کے درخت کی جانب چل رہا ہوں۔ اب یہاں سے دیر تک شکستہ قبروں کا سلسلہ ہے۔ ایسی قبروں کا سلسلہ جن کے رونے والے کوئی نہیں ہے، میں چلتا چلتا ٹھہر جاتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ جان کر تکلیف سی ہوتی ہے کہ میں جسے ناہموار زمین سمجھ رہا ہوں وہ دراصل کوئی قبر ہے اسی قبر جسے پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ایک خیال میرے ذہن سے تیر کی طرح سنسناتا ہوا گذرتا ہے۔ کیا یوں بھی ہوگا کہ کبھی کوئی میرے بیٹے کی قبر سے اسی طرح گذرتا ہوا لمحہ بھر کو رک کر کچھ سوچے گا۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا کتبہ جیسے میرے سینے پر آگیا ہے۔ مجھے پڑھو۔ تمہارے جیتے جی میری یہ حالت ہے۔ میرے حروف مٹ گئے ہیں۔ تمہارے زخم بھر رہے ہیں۔ اُوں حروف پر پھر سے سیاہی پھر کر اپنے زخم ہرے کر لو۔

میں ناہموار شکستہ قبر پر سے اتر کر اس طرح چل رہا ہوں جیسے پیر زمین پر رکھنا ہی نہیں چاہتا ہوں۔ اب میں بوڑھے املی کے پیر کے بالکل پاس

پہنچ گیا ہوں۔ خود رو تنگی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے میری نظروں کو آگے بڑھنے سے روک کر اپنے ہی میں الجھا رکھا ہے۔ میں گھوم کر جھنڈ کے اس سمت پہنچتا ہوں جو نیم کے بالکل نیچے ہے۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا ہوں۔ تازہ قبر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ یہ وہی روح ہے جس کا موم بتیاں جلا کر میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر انتظار کیا ہے لیکن روشنی کے دھبوں کی جانب بے تحاشہ بڑھنے والی یہ روح آج اس تازہ قبر پر اندھیروں کی سو کر رہ گئی ہے۔

”کس کی قبر ہے یہ؟“

میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

”تم کون ہو؟“

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہنس کر۔۔۔ اس کی ہنسی سے مجھے وحشت سی ہوئی۔

”اٹھو۔۔۔ جس کی امانت تھی اس نے تم سے واپس لے لی ہے۔“

میں نے دل مضبوط کر کے یہ جملہ کہہ دیا۔

”اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میری بی جان کی قبر ہے یہ۔۔۔ وہ سنو۔ سنتے ہو؟ بی جان کا بچہ گدرد رہا ہے۔“

”بی جان کا!؟“

لیکن جلد ہی میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں اور اس کا منہ تکتا رہ گیا جیسا میں اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ اپنی جان کا عقد اسی سے کر دیتیں جس کا یہ بچہ ہے۔

اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی۔

ٹوٹی ہوئی قبروں پر بیر رکھتی ہوئی وہ اپنی کھنڈر ہوتی ہوئی حویلی کی طرف تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ اور کھنڈر سے کسی نومولود بچے کے بلک بلک کر رونے کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔

اپنے بیٹے کی قبر پر لوٹتے وقت میں نے اس قبر کو نہ روندنے کے خیال سے جس کی شکستگی نے میرا دل ہلا دیا تھا جانے کتنی قبریں روند ڈالیں جو سرے سے مٹ چکی تھیں۔

ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے لیکن جب میں اس کی تربت کے پائینٹی پہنچا ہوں تو درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا چاند اب اتنا اجگر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی اطراف میں بکھر کر ٹوٹ گئی ہے۔

میں نے بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لئے۔

میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی نومولود بچے کے رونے کی آواز پھر سنی۔

میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھولوں کو پھیر دیکھا اور سوچا ابھی نہیں کہ یہ کس نے چڑھائے ہیں۔

میں نے پھولوں کا رونا کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھادیئے جو میں اسی

لئے لایا تھا۔

میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا — وہ اب درختوں سے
 بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے۔

مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک
 پہنچ گئے ہو تو میں لرز رہا ہوں۔ خدارا زمین کے در و کونہ میں ہی پرچھوڑ آؤ۔ اپنے
 سینوں میں چھپا کر اسے کبھی ساتھ نہ لے آنا۔ میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے
 جو زمین کا سارا دکھ سمیٹ سکوں۔

اور چاند نے بادل کی چادر تان لی۔
 میں ہر چاند کو کفن تو نہیں کہہ سکتا۔

۱۴۹



جمالے جب لکڑی کا برادہ لوسہے کی ٹوکری میں سمیٹنے لگا تو گر ن سنگھ

گر جا۔

یہ کام تیرا نہیں ہے ”جروادے مزدورائے شیخو حرامی سے کیوں نہیں کہتا کہ
دہ اٹھائے کوڑا کرکٹ“

جمالے اس طرح چونکا جیسے زندہ کرنے کی لکڑی پر غلطی سے آری چلتا
ہوا پکڑا گیا ہو۔

شیخو کہیں آس پاس ہی بھاڑ کے سائے میں کالے کالے جامن یا آئس فروٹ
کھاتا رہتا۔ کرن سنگھ کی آواز اس کے کانوں میں کن کھجورے کے مانند کھلتی اور وہ
جیسے درد سے تڑپ اٹھتا۔ جامن منہ میں اس طرح ٹھونس لیتا کہ مکھلے ابھر آتے اور
جو آئس فروٹ ہاتھ میں ہوتا تو بڑا ٹکڑا منہ میں رکھ لیتا کہ ٹھنڈک سے آنکھیں مند

اتیں۔

شیخو کی حکمرانی کرن سنگھ کی پہلی آواز ہی پر ختم ہو جاتی تھی۔ جب ملک کرن سنگھ
رخانے کے برابر ہی اپنے گھر میں بیوی بچوں میں مگن رہتا، شیخو لگتا، اترتا، ہر ایک
بے ٹھول کرتا پھرتا، گول مول ساسا نولاسلونا، نک سکھ کا درست، تمکین چیرے والا
بیل لونڈا اپنے چاہنے والے کاریگروں کے درمیان ایسے ایسے خخرے اور غمزے کرتا کہ وہ
بیکر بھی جنھیں ایسی باتوں کی چاٹ نہ تھی اس کی طرف دیکھنے لگتے۔

جمالے تو شیخو پر مرتا تھا۔ اور شیخو بھی جانتا تھا کہ جمالے کیا چاہتا ہے
سہلے کالے جامن، چکی چکی، آس فوٹ، امرود اور آم روزانہ صبح ڈیوٹی
رہتے ہی کچھ نہ کچھ شیخو کے ہاتھوں میں ہوتا اور جمالے کی جیب ہلکی ہوتی۔
کارخانے میں وقت سے پہلے آنے والے کاریگروں میں جمالے اور شیخو کا
نی مقابل نہ تھا۔ یہ دونوں کارخانے کے لئے کم اور ایک دوسرے کے لئے زیادہ
نت سے پہلے ہی چلے آتے۔

لیکن جمالے مطلب کی بات کبھی نہ کر سکتا۔ سوچ سوچ کر رہ جاتا۔ شیخو
بھی جمالے کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول جاتا۔ کبھی پیچھے سے آکر اس کی کمر سے لپٹ
اتا اور کبھی چوٹی، کبھی دس بندرہ پیسے جو کبھی مل جاتا جھپٹ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ پھر
وہ اتنی دیر تک کارخانے کے باہر رہتا کہ دوسرے کاریگر آئے لگتے۔ پھر کرن سنگھ
بے باہر نکلنے کا وقت قریب آجاتا اور سب کاریگر اپنے اپنے کام پر جٹ جاتے کہ مالک آئے
واپس مہروف دیکھے اور ان کی کارکردگی پر اسے شبہ نہ ہو۔
کرن سنگھ دوسرے بدن کا لحیم ضخیم آدمی تھا۔ کاریگروں کا خیال تھا کہ وہ

باہر سے سخت اور کھر دراپے اور اندر سے نرم اور گزار۔ سارے کارگر اس سے خوف بھی کھاتے اور چاہتے بھی تھے۔ سارے شہر میں کرن سنگھ کا نام فریخ پریکر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی نفاست مثالی ہو گئی تھی۔ ایک معمولی سی تپائی بھی جب تک وہ جاپن پڑتال نہ کر لیتا گا تک کو نہ دی جاتی۔

”پلیسہ کھانا آسان ہے نام کھانا مشکل“ — وہ گاہکوں سے کہتا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ چیز بنکر تیار ہے۔ گاہک کو پسند ہے اور وہ مطمئن ہے۔ پیسے گن کر جب وہ کرن سنگھ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے بڑھتا تو کرن سنگھ ہاتھ کھینچ لیتا۔

”منشی جی“ — اس کی کراری آواز بے درد دیوار کے کاغذ خانے میں بھی گہنڈ کی طرح گونجتی —

”صاحب نے کیا چیز پسند کی ہے؟“

منشی جی کچھ ٹری دائرہ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اٹھتے اور صاحب کی پسند کی ہوئی چیز نکلو اکر کرن سنگھ کے سامنے رکھوا دیتے — وہ الٹ پھیر کر نیچے اور اچھی طرح جاپن پڑتال کرتا —

کبھی کہتا ”آپ پانچ دس منٹ ٹھہر جائیے صاحب“

صاحب ٹھہر جاتے تو کارگر یوں کو ہدایت دیتا کہ فلاں سائڈ میں کیلے نکال کر اسکو وٹ کر دو، کبھی کہتا کہ وارنش کاشٹنگ پانچ دسے دو، کبھی کہتا کہ پینکلی راڈ کے متوازی ایک پٹی لگا دو۔

اگر کام زیادہ ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آج نہ لے جائیے صاحب۔ کل لے

جالیے میں مطمئن نہیں ہوں۔“

اس طرح کرن سنگھ نے کئی بار نقصان بھی اٹھایا۔ کیونکہ کرن سنگھ کی کل ہوئی
 بھی اس نے اپنی مرضی کے مطابق چیز کو بہتر سے بہتر بنا کر دکھا بھی لیکن جانے والے کی کل نہیں
 ہوئی اور چیز دھری دھری گرد میں اُٹی رہی تو کرن سنگھ نے اٹھو کر پھر گودام میں گھو ادیا۔
 کرن سنگھ واقعی عجیب ناک مزاج آدمی تھا۔ جب انتظار کر کے چیز کو گودام
 میں بھیجا دی جاتی اور اگر وہی گاہک آدھکتا چوپندر کے دکھو آگیا تھا تو پھر کرن سنگھ کا
 پارہ چڑھ جاتا۔

”جناب اب وہ چیز نہیں ملے گی۔“

”کیوں کیا بک گئی؟“

”بکی نہیں، دھری ہے، مگر دول گاہ نہیں۔“

”کیوں نہیں دیں گئے؟“

اسی لئے نہیں دول گاہ آپ اسی روز آنے والے تھے اور آئے اتنے دنوں
 بعد میں۔ کرن سنگھ وقت کے ساتھ چلتا ہے۔ نہ وقت ٹھہرتا ہے نہ کرن سنگھ اور
 آپ تو جانتے ہی ہیں، موٹی سی بات ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔“
 اب اگر گاہک بھی سر پھرا ہوتا تو منہ پھلا کر چلا جاتا۔ ورنہ کارہیگر اسے
 آہستہ سے سمجھا دیتا۔

”سیٹھ صاحب وعدہ خلافی سے بہت چڑھتے ہیں۔ ہر وہ وعدہ جو دنا

نہیں ہوتا، انھیں بہت دکھ پہنچاتا ہے۔ جانے وہ کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔ آپ
 کل آکر گودام میں چیزیں دیکھئے اور پھر اسی چیز کو پسند کر لیجئے۔ تب معاملہ پیٹ

پٹ جائے گا۔

خواہش مند کی طلب صادق ہوتی یا ضرورت اشد تو وہ دوسرے دن ضرور آتا اور کرن سنگھ مکرانا اور چیز حوالے کرتا ہوا کہتا۔

”جناب میری محبوبہ نے مجھ سے کہنے کا وعدہ کیا لیکن آج تک نہیں آئی۔ میں آج بھی اس کا منتظر ہوں۔ اور اگر آج وہ آجائے تو پتہ ہے میں کیا کہوں گا۔“

جامورا تو سے یارا نہ نہیں

جائیں نے تو ہے پہچانا نہیں

کرن سنگھ یہ کہہ کر کہیں دور دور کچھ دیکھنے لگتا جیسے کسی کو آتا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن فوراً ہی تہقہ مار کر دھندے سے آگت۔ گاہک کچھ بھی نہ دیکھتا کہ کرن سنگھ کہاں کہاں کی میر کر آیا ہے۔ وہ اپنی چیز پا کر خوش تھا۔ بات ختم ہوتی۔

شیخو کی کرن سنگھ سے رخصت ہوتی تھی۔ جب وہ کام کی دیکھ بھال کے لئے پیکر لگانے نکلتا تو شیخو کونے کونے چھپتا پھرتا۔ حالانکہ کرن سنگھ کے ہاتھوں شیخو کی کبھی پٹائی ہوئی نہ گالی گونج ہی اس نے سنی۔ لیکن وہ یوں ہراساں رہتا جیسے بارش کی بوندوں سے چھیل چھیلی بکری جس کے پیچھے منڈ بو کر پٹ بھی بے بغار ہو۔

شیخو کی ہراسانی کا راز نہ کھلتا تھا۔ لیکن بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ کرن سنگھ نے اس کو ایک بار جمالے کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور دونوں ہی کو خوب پھٹکا رکھا تھا۔

اس روز سے یوں بھی دیکھا جاتا کہ کسی ایسے ایسے جذبے سے مغلوب ہو کر

جمالے نے ایسی جسارت کی شیخو کو پکڑ کر اپنی گود میں بھر لینا چاہا تو شیخو نے جب کچھ نہ چلی تو یہ داؤں لگایا۔

”وہ دیکھو مالک دیکھ رہا ہے۔ چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو بھی“
 بس جملے کی ساری مردی ناکل ہو جاتی۔ وہ جانتا تھا کہ کرن سنگھ کا رخائے کے ہر روز دن سے جھانکتا ہے۔ یہاں کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں اس نے اپنی آنکھیں نہیں رکھ چھوڑی ہیں۔ وہ ہر سوراخ سے کارخانے میں مبتی ہوئی ہر چیز سے جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کرن سنگھ کا کارخانہ قلب شہر سے قریب گھنے درختوں سے گھرے ایک میدان میں تھا۔ بڑے سے ٹپن کے ڈھالے میں وہ چیزیں جمادی جاتیں جو تیار تو ہو چکی ہیں لیکن جن پر ابھی روغن نہ چڑھایا جاتا وہ داہنی جانب شونوم میں جمادی جاتیں جہاں خریدار معائنہ اسباب کرتے۔ کرن سنگھ کا اجلاس یعنی میز، اس کا فون، اس کے کاغذات غرض کہ اس کی نشست ایسی جگہ تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر سارے کارخانے پر بہ یک نظر اپنا حکم چلا سکتا تھا۔ اور واقعی کرن سنگھ کی آنکھیں تھیں بھی بڑی تیز۔ ایسا لگتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ دیکھتی ہیں۔ سارے کاریگر ہی کچھ سمجھتے تھے۔

جانے کیا بات تھی کہ کرن سنگھ ہنستا ہوا بڑا معصوم لگتا تھا۔ سنجیدگی کے لئے اس کا چہرہ سچ پوچھتے تو بنا ہی نہ تھا لیکن کاریگروں پر حکومت کرنے کی اس نے جو عادت ڈال لی تھی وہ اسے کھل کر ہنسنے نہ دیتی تھی۔ اور اس طرح وہ اپنے پر سنجیدگی کا ملمع چڑھائے رکھتا تھا لیکن کاریگروں سے دور اپنی میز پر بیٹھا جب یاہوں دوستوں سے ہنستا تو اس ڈیل ڈول اور بارعب چہرے کے باوجود کچھ بچہ بچہ سا

لگتا تھا۔ ایسا بچہ جو بچوں میں اسکول کا ماسٹر بن کر رعب گنا سٹھ رہا ہو۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے بلڈ پریشر اور شکر کی بیماری نے اس کی مسکراہٹوں کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ کرن سنگھ کچھ کھویا کھویا رہتا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ ادھر عمر کے کرن سنگھ میں چھپا ہوا بچہ ان دنوں تیزی سے بوڑھا ہو رہا ہے اور کرن سنگھ جوں کا توں ہے۔

ویسے کرن سنگھ کو ان لوگوں سے اللہ واسطے سہا بیڑ تھا جو وعدہ کرنے ونا نہیں کرتے تھے۔ اور جب سے اس کی صحت خراب ہوئی تھی چھوٹی چھوٹی بات بھی اسے اکھرنے لگی تھی۔ وہ صبح دوپہر شام نئی نئی قسم کی گولیاں کھاتا رہتا۔ انسولین کے انجکشن خود ہی لگالیتا۔ شہر میں کئی نامی ڈاکٹر تھے قلب کے ماہر معالج تھے۔ لیکن کرن سنگھ کی وضع داری نے اس کو ڈاکٹر سیتل سنگھ ہی کے زیر علاج رکھا جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔ کسی نے کچھ کہا بھی کہ فلاں ماہر قلب کو بتلاؤ تو کرن سنگھ طال گیا۔ اپنی کرداری آواز میں وہ کہتا۔۔۔ پیٹنٹ دواؤں کی اس دور میں سہار ڈاکٹر کدم بہ کدم (قدم بہ قدم) چلتے ہیں کسی میں آگے جانے کا یا راہی نہیں ہے۔ کوئی ماہر قلب (قلب) کیا تیر مارے گا بھلا۔ پھر سیتل کی محبت میرا آدھا مرض کم کر دیتی ہے۔ دن میں دو تین بار تو وہ مجھ سے مل جاتا ہے۔ تمہارے شہر میں کوئی ڈاکٹر ہے جو میرے یہ سب جو پچھلے برداشت کر لے۔ اگر کہنے والے سے بے تکلفی ہو تو تو کرن سنگھ کہتا۔

”بائے چھوڑ یا جروا دے مزدور ان سب ڈاکٹر ایک سماں ہیں۔ کھیل صرف سانس کی ڈود کا ہے اور یہ دور ٹوٹی تو سمجھو کہ پیٹنگ گیا ہا تم سے پھر سب ہی

نہ دیکھتے رہیں گے چھوٹا ہو۔ بڑا ہو۔

کرن سنگھ کی کنی دہتی تھی تو بس پورن سنگھ کی ماں سے۔ پورن سنگھ کی ماں کرن سنگھ کی گھر والی ہے اور پورن سنگھ کا کھوتا بیٹا۔

سردارن بھی مگر کرن سنگھ کا طفلفنہ جانتی تھی۔ جب وہ اپنی بانی پر آتا تو پھر سردارن بھی چپکے سے کھسک جاتی لیکن زیادہ تر کرن سنگھ ہی ہار مان لیتا اور میدان سردارن کے ہاتھ دہرتا۔ وہ کہتا کہ پورن سنگھ کی ماں سے ہارنے میں مزہ ہے جیتنے کو جی نہیں چاہتا لیکن ڈاکٹر سیتل کے معاملے میں کرن سنگھ کا جی نہیں چاہا کہ پورن کی ماں سے ہارے۔ اور اس طرح سردارن چپ ہو رہی۔

کرن سنگھ نے پورن سنگھ کو کبھی پورن نہیں پکارا ویسے وہ پورن سنگھ پر جان چھڑاتا تھا۔ اپنی اس سخت گیری کے لئے وہ کہتا کہ آج کا دور پیار کا تحمل نہیں ہے۔ میرا پیار پورن سنگھ کے متکبر (مستقبل) کو کیل دے سکتا ہے۔ میری سختی ہی اس کو ترکی (ترقی) کے راستے پر چلا سکتی ہے۔ ورنہ کیا میں باپ نہیں ہوں یا۔ (یہ یاد راصل یاد کا محف ہے۔ وہ دے اڑا کر صرف یا کہتا۔)

اور بچ پوچھے تو کرن سنگھ باپ ہی نہیں ماں بھی تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے کرن سنگھ ذرا ذرا میں ہانپنے لگا تھا۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوتی اور وہ غصے میں آجاتا تو اس کا تنفس بڑھ جاتا۔

کارگر جانتے تھے کہ ڈاکٹر نے زیادہ کام کرنے سے کرن سنگھ کو منع کیا ہے۔ یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ غصہ نہ کرے۔ جتنا بن بڑے خوش رہے۔۔۔ ہنسے اور غم نہ کرے۔

کرن سنگھ اپنے معالج سے کہتا — گھبراؤ نہیں سیتل، میں یہاں مردوں کا نہیں۔ جب مرنا ہوگا چپکا سا لہو پیچ جاؤں گا — مان نو پھر نہیں لوٹوں گا میں۔“
یہ بات کرن سنگھ بڑے اعتماد سے کہتا — اس کی زبان سے لاہور کی بات سن کر یوں معلوم ہوتا کہ کرن سنگھ واقعی یہاں نہیں مر سکتا۔ اس لئے کہ اس کا دل یہاں نہیں لاہور ہی میں دھڑک رہا ہے۔

کچھ دیر تک وہ دور دورہ دیکھتا۔ ایسی نظروں سے جو کاریگر جانتے تھے کہ ہر کاوٹ کو پرے ڈھکیل کر بھی دیکھ سکتی ہیں۔

شیخو اب کرن سنگھ سے اتنا خائف نہیں رہا تھا — وہ اس کے حملے آتا اس سے بات چیت بھی کر لیتا — اور کرن سنگھ کسی بات پر کھل کر ہنستا تو شیخو مسکرا بھی لیتا۔

لیکن جملے نے جب کبھی شیخو کے جسم سے اپنی آغوش بھر لینا چاہی شیخو نے پکارا —

”وہ دیکھو مالک دیکھ رہا ہے —“ اور جملے نے محسوس کیا کہ واقعی ایک بار خدا نہیں دیکھے گا لیکن کرن سنگھ دیکھ لے گا۔ اور اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی کہ شیخو نکل بھاگا۔ پھر کالی کالی جامیں، آس فروٹ، بارکس کے جام یا بے نشان آم شیخو کے ہاتھ میں ہوتے۔ وہ بڑا چٹورا تھا۔ محبت سے جملے اسے چکی چکی پکا دے لگا تھا۔

ایک دن کرن سنگھ نے شیخو سے کہا۔ سہمنے والی بلندی پر جو دفتر ہے وہاں جاؤ اور شاعر کو بلالائے — کہنا کہ مالک بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نہیں آؤ گے

تو خود چلا آؤں گا۔

شیخو دفتر پہنچ کر ایک ایک سے شاعر کو پوچھتا پھرا۔ آخر کو مایوس لوٹ کر اس نے کرن سنگھ کو بتایا کہ جس دفتر کو وہ بھیجا گیا تھا وہاں شاعر نام کا کوئی آدمی کام ہی نہیں کرتا۔

کرن سنگھ بگڑا۔ ”اے جروادے مزدور! کسی کروں یا تری۔ اس کا نام تو اور کچھ اور ہے پر وہ شاعری کرے ہے۔ گورا گھٹا۔ چند و اصف۔ تیجھے کو طبع سے بال سنہری چشمہ لگا ہے بڑا دولت مند لگتا ہے لیکن چھ ماہ سے بک سلف کے پیسے نہیں دیتے۔ ہر پہلی کو دوسری پر ٹال دیتا ہے۔“

شیخو ایک دم اچھل پڑا۔ ”اوئے“ اس نے انجانے میں سردار ہی کے لمحے میں کہہ دیا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔ پہچان گیا۔ پہچان گیا۔ اسی نے تو مجھ سے کہا کہ شاعر واکر یہاں کوئی نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ اور شیخو پلٹ کر پھر چپٹ ہونے لگا۔ کہاں چلا یا۔ سردار چلایا۔

لے آؤں مالک اسے پکڑ کے۔ اور شیخو پھر نہیں رکا۔

شیخو لوٹا تب بھی کوئی شاعر واکر تو اس کے ساتھ نہیں تھا۔ البتہ وہ اطمینان سے چکی چکا رہا تھا اور اسی جیب اتنی پھولی ہوئی تھی کہ پھٹ سکتی تھی۔ اس نے کرن سنگھ کو بتایا کہ اب وہ آدمی وہاں نہیں ہے جو رہو ہو ویسا

ہی تھا جیسے اس نے بتلایا تھا۔

کرن سنگھ جان گیا کہ شیخو وصولی کرنے والوں کی چال میکہ گیا ہے۔ اس نے شاعر سے کچھ پیسے بٹور لئے ہیں اور اب باور کروا رہا ہے کہ وہ نہیں ہے۔

کرن سنگھ کا پارہ چڑھا — اس نے جھٹ سے شیخو کا ہاتھ پکڑ کر
اس کو اپنی طرف گھسیٹا — ایک چپیت لگا کر کہنے لگا۔

”بائے وہ جروادے مزدور! شاعر تو اب تیری جیب میں ہے تیرے منہ میں
اب وہی تو چٹکارہ بن گیا ہے پاجی — یہ پیسے تو اسی سے لے آیا ہے۔ کیوں ہے نا“
ہے نا۔“

اور شیخو سر سہلا سہلا کر سو رنے لگا۔

لیکن سردار جی اتنے ہی میں ہانپنے لگا تھا — وہ ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ
اس کو شاعر آتا ہوا دکھائی دیا — وہ اس کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔
”جی چاہتا ہے تلوار نکال کر تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔“

شاعر کو پورن سنگھ سے معلوم ہو گیا تھا کہ کرن سنگھ ان دنوں بیمار ہے۔ ڈاکٹر
نے غصہ نہ کرنے کی امداد آرام لینے کی ہدایت کی ہے — اس نے جب اس کو ہانپتا ہوا
دیکھا تو مسکراتے ہوئے بڑھ کر کرن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ معافیت
کمرے اس کو نارمل کر سکے۔

لیکن کرن سنگھ پیچھے ہٹ گیا۔

”سردار! اب غصہ تھوک بھی دے یا“ — شاعر نے سرداروں ہی
کے پنجابی لہجے میں کہا — ”میں آگیا ہوں۔ دل ٹھنڈا کر لے مگر ذرا دھیرج سے
تجھے تاؤ نہیں کھانا چاہیے سردار — پورن نے مجھے بتایا تھا کہ تیرا جی ٹھیک نہیں ان
دنوں۔“

”تو چاہے تھا کہ مر کھپ جاؤں — قصہ پاک ہو تو تجھے آند ملے کہ

اب کون مائی کالال وصول کرے گا۔“

شاعر نے یہ بات سنی تو منٹ بھر کو چپ ہو گیا۔ پھر اُس نے بڑے دکھ سے کہا۔

”سدا راں یوں کہنے سے اچھا تھا کہ تلوار اٹھا کر میرے ٹکڑے کر دیتا۔“

بھائی۔ کیا تو کوئی بے اولاد ہے۔ وہ جو تیرا پتر ہے پورن کیا وہ میرا گریبان پکڑ کر تیرا قرض نہیں چکالے گا پھر میں کس طرح تیری رقم بچا سکوں گا۔ کاش تو نے یہ بات نہیں کہی ہوتی یا۔ اور کیا۔ اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ پیسے کے لئے میں یہ چاہوں گا کہ تو مر جائے۔ وہ بھی اس قدر حقیر اور ادنیٰ رقم کے لئے؟“

کچھ اس ڈھنگ سے شاعر نے یہ بات کی کہ کرن سنگھ کا پارہ اتر گیا اور اس کا دل موم بن گیا۔

”مجھے پراس لگی ہے“ شاعر کہنے لگا۔ ”ٹھنڈا سا پانی منگوادے اور اگر جی چاہے تو اس میں زہر ڈلوا دے اپنے ہی ہاتھوں اپنا کام تمام کر لوں گا۔ تو کیوں تلوار کھینچنے کی زحمت اٹھائے۔“

اب کرن سنگھ مکرار ہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں شاعر کا ہاتھ تھام لیا۔ تیری ہی باتیں تو میرا پارہ اتار دیتی ہیں۔

”کیا خاک اتارتی ہیں۔ تو نے زبان سے جو گھٹاؤ لگائے ہیں کیا وہ تیری تلوار کی کاٹ سے کم ہیں۔“

”ارے چھوڑنا۔ غصہ تھا بک گیا ہوں۔ تو نے لے انشکام (انتقام) کہہ لے مجھے برا بھلا کرے گالی طرچ۔“

دونوں منس پڑے۔

سردار ہستے ہستے کہنے لگا۔ ”یا تو وا کھی (واقعی) جادوگری کرے ہے۔ کہاں تو میں نے تجھے قتل (قتل) کر دیا تھا۔ اور اب الٹے تجھی سے کئے ریادوں گالی گلوں دے۔“

”ہنیں سدا راں۔ میں قصور وار ہوں بھائی۔ آج رات ریڈیو پر پروگرام ہے۔ یاروں چک بھٹاٹل گا امد تیرے پیسے حاضر کر دوں گا۔“ شاعر کہنے لگا۔
 ”کل تو نے ریڈیو پر شاعری کر تے ہے؟“

”ہنیں سدا راں میں شاعر نہیں ہوں۔ کہانی کار ہوں۔ کہانی سناؤں گا ٹھیک دس بجے رات۔ سنو گئے تم؟“

”فرد سنوں گا، آج تک میں تجھے شاعر ہی سمجھتا تھا لیکن تو نکلا کہانی کار، کہانی میرے جنم جنم کی ساتھی ہے۔ میں فرد سنوں گا یا“

دوسرے دن جب وہ پیسے لے کر کار خزنے سپیچا تو کرن سنگھ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”میں نے جھوٹ نہیں کہنایا۔ تیری کہانی نے دل مل کر رکھ دیا۔ کیا کیا جتن کئے ہیں تب کہیں آنسو چھپا سکا ہوں اپنی عورت سے ورنہ وہ پوچھ بیٹھتی سردار تم رو رہے ہو۔ کیا تم اپنی ماں کے پتر نہیں ہو۔ میں اسے بھٹا کیا بتا سکتا تھا بھائی کہ مجھے اپنی بیماری کی فکر نہیں ہے۔ لیکن چاندنی رات میں راوی کے سینے پر ڈولتے ہوئے بحرے میں کوئی بیٹھا مایا گدھا ہے۔ پانی کے ٹکڑوں میں چاند کا عکس ٹوٹ کر گھل رہا ہے اور میں گانے والے سے کہہ رہا ہوں ہیرا بچھا چھڑنا، ویر جوان اندر جب وہ ہیرا بچھا

چھیڑتا ہے تو اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی ہے۔ میں ذات پات کے ملک اور سرحد کے بندھن توڑ کر کیا اس راوی تک پہنچ سکوں گا۔ جس کے ایک کنارے پر میں نے بحرے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی ریشیاں سے کہا تھا کہ اسی کنارے پر تیرا انتظار کروں گا۔
 ”تو پھر تم نے انتظار کیا ہوتا سدا راں۔“

”شاعر — یا — میں تو آخری سکھ تھا جس نے لہو چھوڑا — پر وہ نہیں آئی، اس نے پاکستان میں رہنا تھا۔“

پھر کرن سنگھ اور شاعر دونوں ہی خاموش ہو گئے۔

لیکن کرن سنگھ یکایک ہنس پڑا — ”لو میں تجھے شاعر کہہ کر پکار رہا ہوں پر کیا جڑا ہے۔“ وہ خود ہی کہنے لگا۔ ”بات ایک ہی ہے۔ میں تجھے یہی پکاروں گا۔“

جب شاعر نے پون سو روپے سدا راں کے ہاتھ پر رکھ دیے تو اس نے پوچھا۔
 ”تجھے اس کہانی کا ریڈیو سننے کیا دیا؟“

”یہی جواب میں تمہیں دے رہا ہوں۔“

”بس؟ — تو پھر لے۔ اس نے دس روپے شاعر کو ٹوٹاتے ہوئے کہا۔“ کچھ تو بھی تو رکھ لے، تجھے پھر دے دینا۔ جب تجھ سے بن پڑے۔ کوئی تاریخ کی کید (قید) نہیں ہے۔“

جب شاعر جانے لگا تو اس نے کہا — ”اوئے شاعراں —
 کبھی کہانی نگار بھی لکھنا بھائی۔“

ایک دن شیخو کارخانے کے قریب سے گزر رہا تھا تو چکی چکی بچپن والے اس کے ایک ہم عمر ساتھی نے پکارا۔

”کیا بات ہے شیخو، کیا کارخانے کی نوکری نہیں کر رہا؟“

ہاں اے شیخو نے بڑی رازداری سے کہا۔ مالک بیمار ہے اور وہ جوہلے ہے نا؟ وہ بُرا آدمی ہے۔ وہ مجھے بہت تنگ کرنے لگا تھا۔ مالک اچھا تھا۔ تب تو میں اسے صبل سے کزنکل جاتا تھا کہ دیکھو۔ مالک دیکھ رہا ہے۔ اور مالک کے نام سے حملے کی نانی مرتی تھی۔ اب مالک بستر کا ہوک رہ گیا ہے۔ کتنے ہی دن سے راونڈ پر نہیں نکلا تو جاملے کے توصلے بڑھ رہے تھے۔

”وہ چاہتا کیا ہے آخر؟“

اے تو بھی بڑا بھولا ہے۔ اور شیخو نے بڑی رازداری سے جھک کر

کچھ کہا۔

”باپ اے، چکی چکی والے لڑکے نے کہا اور دونوں مل کر خوب ہنسے۔

جب تک کرن سنگھ فریش رہا جاملے کے خوف سے شیخو نے کارخانے کا

رخ ہوا نہیں کیا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ کرن سنگھ اب آہستہ آہستہ باہر نکل کر اجلاس پر بیٹھنے لگا ہے۔ البتہ زیادہ گھومنے پھرنے اور کارخانے کا چکر لگانے کی ابھی اسے ڈاکٹر

نے اجازت نہیں دی ہے تو شیخو بھی ایک روز چپکے سے کارخانے جا پہنچا۔ یوں تو وہ چاہتا تھا کہ دس پندرہ دن اور انتظار کرے تاکہ مالک بھلا چکا ہو جائے، لیکن اب اس کے کھانے کے لالے پڑنے لگے تھے۔ دن میں کبھی ایک آدھ بار اسے کھانے کو مل جاتا تو

بھی غنیمت تھا۔۔۔ وہ اس قدر سر پھراکھی تھا کہ دو ہونٹوں میں مسیزوں کی صفائی کی نوکری اس نے کھڑے کھڑے اس لئے چھوڑ دی تھی کہ مالک اور بیروں نے اسے ماں اور بہن کی گالی دی تھی۔

شیخو کارخانے میں گس کر سیدھے اجلاس تک جا پہنچا۔ کارنگیروں نے کام چھوڑ کر اسے اجلاس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔۔۔ جمائے کی آنکھوں میں شیخو کو دیکھ کر چپک سی آگئی۔

لیکن جب وہ اجلاس پر پہنچا تو وہاں کرن سنگھ کی بجائے پورن سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ شیخو سمجھ گیا کہ مالک ابھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ اس کی صحت یا بانی کی خبر اس نے غلط سن رکھی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے چپکا سا کھڑا رہا تھا۔

پورن سنگھ نے شیخو سے پوچھا کہ ہر آئے ہو۔

”مالک کہاں ہے؟“

”اب یہاں کوئی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں پھر ملازمت مل سکے۔“

شیخو کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔ لیکن اس نے خود کو

سنبھالا۔۔۔ ”میں مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔“

پورن سنگھ نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا

منشی جی پاس ہی سے نکل آئے جو شیخو کی باتیں سن رہے تھے۔ انھوں نے شیخو کو آواز دے کر بلایا۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو منشی جی نے کہا۔

”مالک کو مرے آج چوتھا دن ہے شیخو۔ تین روز سے کارخانہ بند

تھا آج کھلا رہے۔“

شیخو کا جی چاہا کہ دائرہ ہی کا خیال کئے بغیر مولوی صاحب کا منہ توڑ دے
 جو ایسی بات زبان سے نکال رہے ہیں — پھر اس نے خود کو ملامت کی۔ یہ نوکری
 سے مایوسی کا غصہ تو نہیں ہے لیکن جب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو وہ کچھ دیر سکتے کے
 حاکم میں پتہ چپ کھڑا رہا۔

”وہ تو صحت مند ہو چکے تھے منشی جی۔“ اتنا کہتے کہتے شیخو کی آواز بھرائی تھی۔
 ”ہاں۔“ منشی جی کہنے لگے۔“ انھوں نے کام بھی سنبھال لیا تھا۔ جس وقت
 مرے ہیں اس سے کچھ دیر قبل اچھے بھلے تھے۔ ایک گاہک نے آرڈر دے کر شادی کیلئے
 چیز منوائی تھی۔ محنت کی خرابی کے باوجود انھوں نے اپنی نگرانی میں دھن کا وہ پلنگہ
 تیار کروایا لیکن وہ صاحب وقت پر نہیں آئے یہاں تک کہ وہ تاریخ کا بھی ٹل گئی جس
 دن انھوں نے بتلایا تھا کہ اس دن شادی ہے۔ جب وہ آئے تو مالک
 سے ان کی تکرار ہو گئی۔ تو تو جانتا ہے نا۔۔۔ وہ جھوٹ بولنے اور وعدہ
 خلافی کرنے والوں سے بہت چڑتے تھے۔ یہ برہمی ان کے لئے جان لیوا ثابت
 ہوئی۔۔۔ سینے میں درد ہوا، اور اجلاس پر بیٹھ ہی تھے کہ
 انتقال کر گئے۔“

شیخو بلک بلک کر رونے لگا۔ پھر آنسو پونچھ کر جب وہ جانے
 لگا تو نئے مالک نے اسے بلایا۔

”تم چاہو تو کل سے نوکری پر آ سکتے ہو۔“ پورن سنگھ نے
 دل گیر ہو کر کہا۔

شیخو کچھ دیر گم سم خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا۔۔۔

”مجھے اب نوکری نہیں کرنی ہے مالک۔“ اور گردن جھکائے وہ کسی کی طرف دیکھے
 بغیر لوٹنے لگا۔ سبھوں نے اس کو جاتے ہوئے پھر ایک بار دیکھا۔ لیکن اب
 وہ کارخانے سے باہر جا رہا تھا۔ کمرن سنگھ فریجریسٹر کے اس کارخانے سے باہر
 جو سایہ دار درختوں کی گھٹی چھاؤں سے گھرا ہوا تھا اند جس کے باہر بھی اتنی ہی کڑی
 دھوپ تھی جتنی اندر۔

انکشاف

لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے۔

ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گیتا ریجانے والا جانڈس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا۔ لیکن لوگ اس کو جانڈس ہی پکارتے تھے۔ اینگلو انڈینس کی چھوٹی سی کالونی میں تقاریب کے موقع پر ڈیوس گیتا ریجانتا تھا۔

چاندنی راتوں میں قلعے کی فصیل سے باہر ندی کے پل پر نوجوانوں کی جو بھی ٹولی نظر آتی اس میں خان صاحب اور ڈیوس دونوں ہی کی شمولیت یقینی ہوتی اور ڈیوس کے گیتا ریخان جھوم جھوم جاتا۔

ڈیوس نے انجیل مقدس کی یہ عبارت سنائی جو اسے از بر تھی اور لوگ خاموشی سے سننے لگے۔

”قانونی گلیل میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی۔ اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی۔ اور جب مے پونجی تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ آگے پاس نے نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت تجھے مجھ سے کیا کام ہے؟ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ اس کی ماں نے خادموں سے کہا۔ جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔ وہاں یہودیوں کی طہارت کے دستور کے مطابق پتھر کے چھ منگے رکھے تھے۔ اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا منگوں میں پانی بھر دو۔ پس انہوں نے ان کو لبنان بھر دیا۔ پھر اس نے ان سے کہا اب نکال کر میری مجلس کے پاس لے جاؤ۔ پس وہ لے گئے۔ جب میری مجلس نے وہ پانی پیچھا تو مے بن گیا تھا۔“

ڈیوس نے یہ کہہ کر لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب کے سب اسی کا منہ تنک رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی اور نئی بات کا انکشاف کرنے والا ہے۔ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی۔ اور کہنے لگا۔

”یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مادہ کرے گا۔“

میری طرح شاید بھی لوگ جلتے تھے کہ خان کو کیوں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے کسی نے کچھ نہ پوچھا اور ان میں سے کتنے ہی تھے جنہیں یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس پر بھی کسی نے کچھ نہ پوچھا۔

ڈیوس میکر بہت قریب ہو گیا۔ کہنے لگا سردار رنجیت سنگھ سے
خان نے کہا تھا۔

تمہاری رات اُجالوں سے متور ہوگی اور تمہارے ہتھے سناٹوں کا سینہ شوق
کرس گئے۔ اور تمہیں شادی کی تقریب میں میرے جیتے جی ایک بوند شراب کی کمی محسوس
نہ ہوگی۔ لیکن وہ گوشت نہیں کھاؤں گا۔ جس سے تم تقریب میں تواضع کرو گے۔ میرے
لئے ذرا کئے ہوئے دینے کے گوشت کا علیحدہ انتظام کرنا ہوگا۔

ادرسر دار رنجیت سنگھ نے خان کے لئے صلح ٹنک آکر خود ہی گوشت خریدا
تھا اور اس نے کسی دوسرے سردار پر بھر دوسرے ٹنک نہ کیا تھا کہ کوئی خان کے آگے کہیں جھٹکے
کا گوشت نہ پیش کر دے۔ اور حقیقتاً سردار رنجیت سنگھ نے خان کے لئے اپنی نگرانی
میں ٹنن کر دیا ہوگا۔ اور اس کا منتظر ہوگا۔ لیکن اب خان وہاں نہیں جاسکتا اس لئے
کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔

اس صلح کے خشک قرار دیئے جانے سے پہلے خان کی وجاہت کے
ساتھ ساتھ اس کی وردی کا بائیں بھی نہ صرف سارے صوبے میں شہور تھا بلکہ حجاز
میں بھی اس کی بات ہوتی تھی۔ خاکی رنگ کی کلف چڑھی وردی زیب تن کئے جب
خان بستی سے نکلتا تو اس پاس کے لوگ وردی کی کھڑ کھڑا ہٹ سے خان کی آمد
کا پتہ پہلا لیتے۔ چڑے کا بلٹ جس سے خان کی کمر کسی دہتی تھی۔ خان نے بڑے
اہتمام سے دھرمولیدور کس میں مٹین پر سلوایا تھا۔ دم، برانڈی اور دھکی کے
نپ کندھے کے سہارے سینے پر لگے ہوئے ترچھے بلٹ میں وہ اس طرح کھڑکیا
جیسے تمنعہ سجا رکھے ہوں۔ یہ بلٹ بھی چڑے کا تھا جس کو خان نے اپنی نگرانی

کرتا۔ یہ گویا اس کے فن کی قدر دانی ہوتی۔

لیکن جب یہ ضلع "خشک" قرار دیا گیا تو ندی کے پل پر جمنے والی محفلیں جیسے
یک لخت ابڑ گئیں۔

خان کے لئے بڑی مشکل آپڑی تھی۔ وہ شے جو اس کی شخصیت کے
ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ وہ پہنا و اجڑا اس کی انفرادیت بن گیا تھا وہی یک لخت اُسے
ترک کر دینا تھا۔ جیسے خان کے کاروبار میں مے فروش کا بھی ایک حصہ تھا لیکن اس کو
اپنے کاروبار کے ترک کرنے سے زیادہ اس بات کا انخوس تھا کہ اس کی وردی کے
تمغے چھن گئے تھے۔ اور اب بغیر اس سامان کے اس کی وردی میں کوئی دلکشی نہیں رہی
تھی۔ وہ دودن تک گھر سے نہ نکلا۔ لوگ بے چین تھے کہ خان کو دیکھیں۔
دو ایک جو قریبی دوست تھے وہ اس کے گھر پر پہنچے۔ لیکن اس کی بیوی نے اندر
ہی سے جواب دے دیا کہ خان گھر پر نہیں ہے۔ نامراد دوست واپس ہوئے تو
اکھنوں نے دوسروں کو بتلایا کہ خان گھر پر رہ کر بھی ملنے سے گریز کر رہا ہے۔
تیسرا دن بھی یوں ہی گذر گیا اور خان جتنی میں نظر نہ آیا۔

دودھ گھر کی سرسوتی بائی کو سب سے زیادہ فکر لاحق تھی۔ روزانہ پائو بھر
دودھ اور پائو بھر دہی صبح سویرے وہ بائی کی دوکان ہی پر کھڑا غار جاتا تھا۔
تین دن سے اس کے نہ آنے کی وجہ سے بائی جی کو نقصان ہو رہا تھا۔

ڈپوس سب سے زیادہ بے کل تھا۔ چاندنی راتیں قریب آ رہی
تھیں۔ ایک رات گذرتی تو دوسری رات زیادہ اُجالے اپنے جلو میں لے کر چلی
آتی۔ دمکتا ہوا چاند ہر شب ندی کے پانی میں نہانے کے لئے اُترتا۔ اور

اس کا مکھڑا زیادہ ہی نکھر آتا۔۔۔ خان کے دوستوں کی ٹولی دو ایک بار سیرِ شام
فصیل کے باہر ندی کے پُل پر گئی بھی لیکن جلد ہی لوٹ آئی کیونکہ ڈیوس نے اپنی گیتا رکھی
ساتھ نہیں رکھی تھی۔

ڈیوس نے دل ہی دل میں سوچا۔۔۔ میں جاؤں گا تو خان ضرور مجھ
سے ملے گا۔

اور رات گئے عام راستے سے ہٹ کر وہ چکر کاٹتا ہوا خان کے گھر پہنچا کیونکہ
درمیان میں وہ ایک دوسرے دوستوں کے گھر بھی ملتے تھے اور ڈیوس چاہتا تھا کہ وہ
تنہا خان سے ملے۔

خان کی بیوی نے جب ڈیوس کا نام سنا تو اس کو باہر ہی روک کر وہ دروازے
تک پہنچی آئی۔۔۔ اس نے بتایا کہ خان ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔ دھسکی کی بوتلی
بھی اس کے ساتھ ہے اس نے بہت منع بھی کیا لیکن خان نہیں مانا۔ وہ ڈر رہی ہے کہ
خان گرفتار نہ ہو جائے۔

ڈیوس لمحہ بھر کو خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "خداوند یسوع اس کی مدد
کرے گا۔ خدا کا بیٹا جس نے جہنم کے اندھے کو آنکھیں عطا کیں۔"

اور ڈیوس روانہ ہو گیا۔۔۔ اس نے بستی کا چکر کاٹ کر فصیل کے باہر
پہنچیم کی اور سے ندی کا رخ کیا۔ اس کو خیال گذرا کہ خان یقیناً پُل پر ہو گا اور
تنہا بیٹھائے سے جی پہلا رہا ہو گا۔

ڈیوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جب پُل پر نمودار ہوا تو خان نے ذرا سا
پس و پیش کر کے اسے پہچان لیا۔ ایک شانے کے لئے خوف کی پرچھائیں

خان کے دل سے ہو کر گذر گئیں لیکن اس نے ندی کے پانی میں پتھر پھینک کر جانے کے
عکس کو درہم درہم کر دیا اور ڈیوس کو یہ جھلانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت بھی
نہیں ڈرتا تھا جب کہ اس نے ڈیوس کو نہیں پہچانا تھا۔

خان نے گلاس بھر کر ڈیوس کی طرف بڑھایا۔
لیکن ڈیوس نے ہاتھ بڑھانے میں بہت دیر کی۔
”ڈرتے ہو“؟ خان نے پوچھا۔

”ہاں ڈرتا ہوں — اس لئے کہ تم اگر اسی راستے پر چلتے رہو تو ملنے
جھٹنے والے تم سے کٹ جائیں گے — تمہارے دوست تمہیں پہچان کر بھی نہیں پہچانیں
گے — اور اس طرح ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔“
”کیا تم ابھی ابھی انجیل پڑھ کر آئے ہو — تم انجیل مقدس کی باتیں بھی کچھ
اسی ڈھب سے کرتے ہو جیسے اس وقت مجھ سے کلام کر رہے ہو —“ خان یہ
کہہ کر ڈیوس کو تیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

ڈیوس نے ایک ہی ٹاپخ میں سارا گلاس خالی کر دیا — ”مے کی قسم
میرے بیٹے کا بتیسرا نہ ہو اگر تمہیں اس راستے سے ہٹا نہ لوں۔“
”کیا بچتے ہو؟“ — خان بپھر گیا۔

”یسوع کا کوئی پیرو ایسی بات نہیں کرتا جو میں نے کی ہے۔
خان لیکن چوکا نہیں —“ اور بات تم نے اس لئے کی کہ تمہارا کوئی بیٹا
نہیں ہے۔“

”اور جو ہوتا بھی تو میں یہی بات کرتا —“ ڈیوس نے کہا۔

”لیکن میں کل تک بُرا نہ تھا — آج کیوں اتنا بُرا ہو گیا ہوں کہ تم مجھے دوستوں کے کفارہ کرنے سے ڈراتے ہو؟“

”تم بُرے نہیں ہو — میں نے کب کہا کہ تم بُرے ہو گئے ہو — لیکن تمہیں یہ زمین چھوڑ دینی ہوگی، جس کی مٹی سے تم بنے ہو یا پھر یہ راستہ چھوڑ دینا ہو گا جس پر تم چل پھوٹے اور جو اس زمین پر درد تک نہیں جاسکتا۔“

”میں سوچ رہا ہوں — خان نے کہا کہ ”یہ زمین چھوڑ دوں گا۔“

لیکن یہ وردی نہیں چھوڑو گے جو تم آج بھی پہنے ہوئے ہو اور جس میں آج بھی دھبکی اور دم کی بوتلیں تم نے لگا رکھی ہیں۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں — یہ وردی میرا اصلی روپ ہے۔ میں اپنے اس پہناوے کو چھوڑ کر خود کو نکسا محسوس کرتا ہوں اور بستی میں نپٹتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

”میرا ایک بھائی ہے۔ بہت قریب کے ضلع میں جہاں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔“

”اور ہم سب تمہارے کوئی نہیں ہیں — یہ ندی، یہ ندی میں نہانا ہوا چاند تمہارا نہیں ہے — وہ قہقہے جو اس وقت تمہارے اطراف نہیں ہیں لیکن کل تمہارا یہ سجھا کرنے والے ہیں کیا وہ بھی تمہارے نہیں ہیں۔ میرا گیتا راجے میں نے تمہاری روپوشی کے بعد چھوا تک نہیں ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے — تم یہ زمین آسانی سے چھوڑ سکو گے؟ — تم سمجھتے ہو کہ جب تم جانے لگو گے

”مجھ پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ گئے“ خان نے ڈیوس سے پوچھا۔
جب تم اتنے دنوں سے نہیں ملے تو میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہاری بیوی
مجھ پر بھروسہ کیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم باہر گئے ہو۔ اور اسی طرح گئے ہو جو
تم روز ہی گھر سے نکلتے تھے۔

خان کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”اس نے اچھا کیا۔۔۔ وہ کہنے لگا۔“
گویا میری مدد کو بھیج گئے ہو۔“

اب بتاؤ بھی میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں“
”لو یہ سچا کچی پالیس“۔۔۔ کچھ دیر توقف کر کے خان پھر کہنے لگا۔
درجیت سنگھ کو میں نے زبان دی تھی۔ اس وقت تک یہ نیا قانون نافذ نہیں
تھا۔ اس کے آبائی قریہ میں اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس کو نئے قانون
نفاذ کی اطلاع بھی نہیں ہے۔
وہ عدد دار گاؤں میں ہے۔ مال اس تک نہیں پہنچے گا تو اس کی بڑی سبکی ہو
۔۔۔ میرا آدمی تمہارے ساتھ لے گا۔ جیب میں تمہیں شراب کے بیرل اسے پہنچانے
۔۔۔ اسے ساری باتیں بتا دینا کہ صبح ہونے تک اگر شراب ختم نہ ہو تو وہ مصالحہ کرد
۔۔۔ میں سیر خد ہی رہوں گا تاکہ پکڑا جاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پولیس کو تیا چل
گیا ہے۔ وہ مجھے گرفتار کرے گی تو پھر مطمئن ہو جائے گی اور درجیت سنگھ تک
پہنچنے کی کوئی زحمت نہیں کرے گا۔

”تم خود کو گرفتاری سے نہیں بچا سکتے؟“

بالکل نہیں۔ اور اگر بچاؤں تو درجیت سنگھ کے رنگ میں بھنگ

بڑ جائے گا جو مجھے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں ہے۔

تو پھر اٹھو — ”خداوند سیور ہمارے مدد کر لگیا“ — ڈیوس خان سے پہلے
کھڑا ہو گیا۔

بچی کچی انھوں نے بوتلوں ہی سے پی —

خالی بوتلیں مٹی بھر کر انھوں نے ندی کے پانی میں پھینک دیں جو فوراً ڈوب
گئیں۔

پل پار کر کے جب وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو گھنے درختوں کے سایوں
میں پہنچنے سے پہلے ڈیوس نے کہا۔

”تم مانتے ہو کہ یہ چاندنی سچی ہے جو تمہارے اور میرے اطراف پھیلی ہوئی ہے
اور جو ہمارے دلوں کا راز جانتی ہے کہ ہم کہیں اس کا ساتھ چھوڑ کر گھنے جنگل کی بھیانک
تاریکی میں خود کو چھپا رہے ہیں۔“

”ہاں — خان نے سینہ تان کر کہا کہ میں مانتا ہوں“

”تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس زمین کو نہیں چھوڑو گے جس پر ہم نے جنم
لیا ہے۔“

”مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ چاندنی ہم پر حرام ہوگی اگر وہ کسی اور خطہ زمین
پر ہمیں ملے۔“

خان نے ڈیوس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لئے
اور اتنی زور سے دبایا کہ ڈیوس مسکرا کر بھی ترپ اٹھا۔ اس نے اپنے ہاتھ خان کی
گرفت سے کھینچ کر اس وقت تک جدا نہیں کئے جب تک کہ خان کی گرفت خود وہیلی

اور پھر دونوں روانہ ہو گئے۔

دس مہینے بھڑے چاند نے اور اس کی چمکی ہوئی چاندنی نے انھیں تاریکیوں کو سوئپ دیا۔ اور پھر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈیوس اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔ اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان بتانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جبریل رہا تھا وہ گیتا رچلنے والا جانڈس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا لیکن لوگ اس کو جانڈس ہی پکارتے تھے۔ اس نے مقدس انجیل سے ماخوذ قانانی گلیل میں شادی کا قصہ سنایا تو سب کے سب اسی کا منہ تک رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی نئی بات کا انکشاف کرے گا۔ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی اور کہنے لگا۔

یوحنا رسول کی معرفت لکھی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا، کیونکہ

”صبح سویرے جب خداوند یسوع، سیکل میں آیا اور سب لوگ اس کے پاس آئے اور وہ بیٹھ کر انھیں تعلیم دینے لگا اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے پہاڑ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا۔

اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے تو دیت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔ پس تو اس عورت کی نصیحت کیا کرتا ہے....“

یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔ جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے تو اس نے سیدھے ہو کر اُن سے کہا کہ جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس پر پتھر مارے۔ اور پھر جھک کر زمین پر انگلی سے لکھنے لگا۔ وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے سب نکل گئے اور یسوع اکیلارہ گیا اور وہ عورت وہی زچہ میں رہ گئی۔

یسوع نے سیدھے ہو کر اس سے کہا کہ اے عورت یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا تجھ پر کسی نے حکم نہیں لگایا؟ اس نے کہا اے خداوند کسی نے نہیں۔ یسوع نے کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا۔ جا۔ پھر گناہ نہ مکرنا۔

یہ کہہ کر ڈیوس خاموش ہو گیا۔

سب کے سب اب بھی اس کا منہ تک رہے تھے۔

مجھے اب یہ سوچنے کی گنجائش نہیں تھی کہ ڈیوس نے کسی نئی بات کا انکشاف نہیں کیا۔

ایک طوفان

دو بوندیں

میں کا منور کے ناظر کی کہانی آپ کو سنانا چاہوں تو مجھے یادوں کے
 فیسنے کرید کرید کر اپنا بچپن ڈھونڈ لانا پڑے گا تاکہ اس کو جھاڑ جھٹک کر میں
 آپ کے آگے پیش کرنے کے قابل بناؤں۔

کا منور کا ناظر اور میرا بچپن قریب قریب سا تھ سا تھ مر گئے ہیں اور اس
 کے بعد تجربات کی بھی میں تپ تپ کر میرا وجود ایک سرخ لوہے کی مانند ہو گیا
 ہے کہ ہر کوئل سی نرم و نازک سی شے اس سے مس ہو کر جل اٹھتی ہے۔ تب ہی تو
 میرے لئے مصیبت یہ آپڑی ہے کہ میں اپنے بچپن کو جھاڑ جھٹک کر نکھاروں نہ تو اس
 بھی اور اپنے وجود کے شعلوں سے اسے جھسلنے بھی نہ دوں۔

آئیے میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ میرے بچپن پر میری اس جوانی کا
 کوئی سایہ نہ پڑے۔

ناظر جسے سب ناظر صاحب پکارتے تھے ہمارا اطلاق تھا اور ابا کا مصاحب۔ عجیب میاں قسم کا مرخان مریخ آدمی تھا۔ دوہری ہڈی کا بھاری بھر کم انسان، خوش مذاق، خوش مزاج، خوش خوراک، ہماری دیکھ بھال اور ابا کی خوشنودی اس کا فرض اولین تھا۔ ہم نے فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اسی سے حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ابتدائی تعلیم انتہا کو آج تک نہ پہنچ سکی۔ لیکن کامنور کے ناظر کا ہماری اس نیم حکیمی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس نے جو کچھ علم اپنے پاس تھا ہمیں چھٹپٹیں ہی میں گھول کر پلا دینا چاہا اور بقول کسے بنیاد مضبوط ہونی چاہیے، عمارت کا کیا ہے، اور اسی مضبوط بنیاد پر ہم آج تک ایک پاؤں پر کھڑے ایسٹنٹے رہتے ہیں۔ عمارت کی ہمیں خبر نہیں۔

ناظر صاحب جہاں ہم بچوں میں بہت مقبول تھے ابا بھی انہیں اتنا ہی پسند کرتے تھے۔ ناظر صاحب کا شام کا وقت جب ہم کھلے میدان میں یا چمن میں کھیل رہے ہوتے ابا کے ساتھ گذرتا تھا۔ ہم لوگ قریب ہی کہیں ہوتے تو اس تھوڑے سے وقت میں جو ناظر صاحب ابا کے ساتھ گزار رہے ہوتے ہم ان کے فلک شگاف تہقہ سنکر چمن کے اسی درمیانی حصے کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے جہاں ابا اور ان کے دوست احباب بیٹھے رہتے۔ ہمارے لئے دلچسپی کا باعث صرف ناظر صاحب کا یہ فلک شگاف تہقہ ہوتا تھا جو ہمیں کھیل کود کے دوران بھی چونکا دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ ہم جان جاتے کہ ناظر صاحب سے ابا نے کوئی دلچسپ مذاق کیا ہے اور یہ تہقہ اسی خوشگوار حادثے کا اعلان ہے۔

ہوتا یوں تھا کہ جب ابا کے احباب جمع ہوتے اور ان کی چائے یا ٹھنڈائی سے تواضع کی جاتی تو کبھی کبھی ابا بطور خاص امی کو ہدایت کر دیتے کہ

اوکالیاں برس رہی تھیں اور اب کے برس ان کا انداز بڑا طوفانی سا تھا۔
 اوکالی تو اس طرح برستی ہے جیسے کوئی لیٹر کسی خوشی کی تقریب کے موقع پر دیکھا گیا نڈل
 ہو کر دھائیں دھائیں بندوقیں داغ دیتا ہے اور ساری محفل بکھر کر رہ جاتی ہے۔
 اور وہ مال و مستاع لیکر فرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اب کے برس اوکالیاں جیسے ہمارے
 ضلع کو تاراج کرنے پر تلی ہوئی تھیں، ایک دن نہیں گزرتا کہ وہ پھر حملہ آور ہوئیں۔ ان
 بجلیاں اتنے کڑا کے ان کے ساتھ ہوتے کہ ضلع بھر کے گھر کانپ کانپ جاتے
 اور ساری بستی جیسے پانی کی چادر اوڑھ لیتی۔

ایسے میں کامنور کا ناظر ہم بچوں کو لئے ایک کمرے میں ہماری دلچسپی کا
 سامان بنا رہا تھا۔ ہم گھبراہٹ میں ہوں تو ہمیں لطیفے سنا کر ہنساتا رہے ان دنوں کی بات ہے
 جب میں کوئی بارہ برس کا تھا۔ لیکن اس رات قرآن کی ایک آیت ہم بچوں کے
 دروزبان ہو کر رہ گئی تھی جو بجلیوں کے کڑا کے وقت خاص طور پر پڑھی جاتی تھی
 اور کامنور کا ناظر بھی منہ ہی منہ میں ہی گنگنا تا جھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی آنکھیں
 جی بند کر لیتا لیکن شاید ہمارے خیال سے پھر اس کی آنکھیں بغیر آواز کے پٹ
 سے کھل جاتیں کہ ہم بچے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ذہنی طور پر ہم سے جدا ہو گیا ہے۔
 اس کے اس طرح تیزی سے آنکھیں بند کر لینے اور چمک کر دیکھ کر کھول دینے میں اس
 کی اضطرابی کیفیت کا پتہ چلتا تھا۔ ورنہ آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح نہ کھلتی ہیں
 نہ بند ہوتی ہیں۔ وہ تو در بچوں کی طرح داہوتی ہیں اور کوڑوں کی طرح بند
 ہوتی ہیں۔

ابا ضلع کے حاکم اعلیٰ تھے اور وہ ان دنوں دورے پر تھے۔ کامنور کا

ناظر صاحب کے لئے خصوصی تیاریاں کی جائیں اور تقسیم کے وقت نہایت احتیاط برتی جائے تاکہ ان کا پیالہ یا گلاس کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب امی کیری کے افشردہ میں باریک پسی ہوئی ہری مرچ ملا دیستیں۔ میلچائے میں پسی ہوئی سرخ مرچ۔ پٹشی کا ملازم بندو خاں اس راز سے واقف ہوتا اور اسی کے ذمے تقسیم کا فرض ہوتا جو ہونا چاہیے تھا پہلے تو ایسا ہوا کہ ناظر صاحب نے آدھی چائے پی لی۔ اپنے چہرے سے ناگواری کا احساس نہ ہونے دیا۔ اب اس کے دوست احباب انھیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں محفوظ ہوتے رہے۔ لوگوں نے چائے کی تعریف کی تو ناظر صاحب نے بھی کی۔ اس بار ابانے اصرار کیا کہ اور پیجئے۔ ناظر صاحب نے وہی پیالی کہاں پی تھی۔ بدقت تمام چار چھ گھونٹ لیکر دکھا دے کہ لئے چمکیاں لے رہے تھے۔ جب ملازم نے خالی پیالیاں سمیٹ لیں۔ تو ابانے اور ان کے دوست نے ناظر صاحب کی پیالی کو دیکھا جو آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ابانے اصرار کیا کہ پسند نہیں آئی ہو تو کبھی دیجئے میں دوسری منگوادوں۔ ناظر صاحب جربذ ہوتے رہے۔

کہنے لگے۔ جی۔ جی بہت اچھی ہے۔ لیکن۔ لیکن۔ لیکن کچھ نہیں پسند ہے تو پھر دوسری ڈیجئے۔ سمجھوں نے اصرار کیا۔ اور ناظر کا منورہ نے ایک درگھونٹ حلق سے جلدی سے اتارنے کی کوشش میں منہ بنایا لیکن نکل نہ سکے تو سبھوں کی ہنسی نکل گئی۔ جب اصلی بات ناظر صاحب کی سمجھ میں آئی تو ان کا تعقیب ساری فضا میں پھیل گیا۔ جتن سے لگی امی بھی گھڑی تھیں سوہنس پڑیں۔ اس کے بعد ناظر صاحب نے ایک نہیں دو پیالیاں منگوائیں جن میں لبالب ملائی بھری ہوئی تھی۔

ایک دن تو کامنوری کے اس ناظر نے کمال ہی کر دیا۔ کیری کا انشر وہ جس میں ہری مرچ بادیک پیس کر ملائی گئی تھی اس قدر اطمینان سے پی گئے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ سبھوں نے یہ سمجھا کہ آج ناظر صاحب کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا جاسکا ہے جس کا تذکرہ ابا نے پہلے ہی احباب سے کر رکھا تھا۔ بندو خان جس گلاس کی طرف اشارہ کر دے اسے کوئی چھوٹے ہی نہیں۔ سبھوں نے احتیاط برتی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور ناظر صاحب اطمینان سے ہونٹ چاٹتے بیٹھے رہے۔ خالی گلاس نے بننے کے لئے جب ملازم آیا تو ناظر صاحب نے کہا کہ میاں اب اصلی شربت کے دو گلاس لا دینا۔ سبھوں نے پوچھا تو کیا وہ اصلی شربت نہ تھا۔ جو آپ نے ابھی ابھی پیا ہے تو ناظر صاحب نے اپنا فرانسیسی تہقبہ فضا میں بکھیر دیا۔ کہنے لگے وہ تو کیری کی سیال چٹنی تھی۔ جو میں نے اس محل سے اس لئے پی لی کہ آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ہی نہ دوں۔ سبھوں نے ان کی اس زندہ دلی کی داد دی اور ابا نے ہارمان لی کہ کبھی آج تم جیتے اور میں ہاوا۔

ناظر صاحب بڑے دکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ابا کی ان سے اس قدر بے تکلفی کے باوجود کبھی ہم بچوں کی جرات نہ ہوتی جو ان سے ایسا کوئی ناشائستہ مذاق کرتے جو آداب اور تمیز کے مغائر ہوتا۔ وہ ہم سب سے بڑی شفقت اور پیار سے پیش آتے۔ بڑی دل دہی سے ہمیں پڑھاتے اور یہ ساری پڑھائی لکھائی بڑی دوستانہ فضا میں اس طرح ہوتی کہ ہمیں بوریت کا کبھی بھی احساس نہ ہوتا۔ پیشی کے بندو خان اور ناظر صاحب میں بڑی گھلتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بندو خان اندرون خانہ سارے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے

ناظر صاحب بھی بحیثیت اطالیق چونکہ گھری کے ایک فرد ہو گئے تھے اس لئے انھیں بندو خاں کی اہمیت کا اندازہ تھا۔

ادھر بندو خاں کا یہ حال تھا کہ وہ ناظر صاحب کی قابلیت اور علمیت کے بڑے معترف تھے۔ گتھیلے بدن کے یہ بندو خاں جب ہمارے گھر میں پہلے پہل ملازم ہوئے تھے تو بڑے گاؤٹی قسم کے پھلکا آدمی تھے۔ ان کے اوصاف نے ابا اور امی کے دلوں پر جو نقوش ثبت کئے تھے وہ زیادہ تر ان کی مثالی دیا ننداری کا سبب تھے۔ بڑے سے گھر دار شملے، سفید کرتے اور سفید دھوتی میں ملبوس بندو خاں کو دیکھ کر ہمیں اس کے آداب اور بات چیت کی تمیز تو خیر آتی لیکن کچھ ہی دلوں میں انہوں نے اپنی ایک اندازی کے بوسے پر گھر کی ساری چابیوں پر قبضہ کر لیا۔ باورچی کو غلہ بندو خاں ہی دیتے۔ چیرا سیوں سے سودا سلف بندو خاں ہی منگواتے، دھوبن کو کپڑے لے کر حساب بندو خاں ہی کو بتلانا ہوتا۔ گوالا بھینس لے کر صبح و شام دروازے پر آتا تو دودھ دھونے کے لئے بندو خاں ہی کا منتظر رہتا اور بندو خاں طبع سے رجسٹر میں ہر شے کا حساب کتاب اس قدر نفاست سے لکھ لکھتے جیسے ابایا امی اس کی آڈٹ کرنے والے ہوں۔ ویسے بندو خاں کو اس بات کا علم تھا کہ ان پر اس حد تک ان کے مالکوں کو بھروسہ ہے کہ حساب کتاب بتلانے کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن ان کی اپنی دل کی دنیا ان کے اپنے ایمان کی روشنی سے جو منور ہو جاتی۔ اور یہی نور تو بندو خاں کی زندگی کا نور تھا۔

بندو خاں کا خط بڑا پختہ اور بہت ہی خوبصورت تھا۔ ابلنے جب پہلی بار ان کی تحریر دیکھی تو بڑے متعجب ہوئے۔ سامنے لکھوا کر یقین کیا تو ہر

قربی دوست کے آگے ذکر کیا۔ ابا کی زبانی اپنی تعریف اور توصیف سن کر بندو خاں پھولے نہ سماتے۔ اپنے خط پر ان کو بھی بڑا ناز تھا۔ لیکن اب تو ان میں ایک ایسی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی جو اتنے بڑے گھر کا نظم و نسق چلانے کے لئے شاید ضروری تھی۔

ناظر صاحب سے بندو خاں کی یگانگت کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ بندو خاں ان کی علمیت کے معترف تھے تو وہ بندو خاں کی خوش نویسی کے مداح۔ فارسی اور اردو شاعروں کے بے شمار پسندیدہ اشعار جو ناظر صاحب کی بوسیدہ بیاض میں محفوظ تھے وہ انھیں ایک نئی بیاض میں بندو خاں سے نقل کروا رہے تھے گھر کے کام کاج سے فراغت پا کر راتوں کو بندو خاں ٹٹے انہماک سے یہ کام کرتے بیٹھے اور اسی کام کے دوران وہ آہستہ آہستہ ناظر صاحب کی قابلیت کے دل ہی دل میں معترف ہوتے گئے کیونکہ بیاض میں لکھے اکثر شعر ان کی سمجھ میں نہ آتے جنھیں وہ من وعن نقل کرتے۔

ناظر صاحب ناشتے سے فراغت پا کر ہمارے گھر چلے آتے، پھر اپنے گھر لوٹتے لوٹتے انھیں رات کے دس بجے بھی جاتے گیارہ بجے بھی ہم ان دنوں اسکول نہیں جاتے تھے۔

ناظر صاحب ہی ان دنوں ہماری دیکھ بھال کرتے اور تعلیم و تربیت کا فرض پورا کرتے۔ ایک بڑے سے کمرے کے نصف حصے میں ہم بچوں کی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور دوسرے نصف حصے میں قطار سے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ شام کے پانچ بجے تک ہمیں اپنی اسی دنیا میں مانس لینا ہوتا۔ پانچ بجے

ہمیں باہر نکلنے کی اجازت تھی جس کے ہم دن کے تین بجے ہی سے بے چینی سے منتظر رہتے۔ قریب قریب سارا دن کا منورہ کے یہ ناظر صاحب ہمارے دل دماغ پر سوار رہتے۔ ان کے پڑھانے کا سلسلہ تین تین گھنٹے تک چلتا یہ تین گھنٹے ہمارے سنے دو بھر نہ ہوتے۔ نازسی اور اردو پر ناظر صاحب بہت توجہ دیتے۔ سبق آموز اور نصیحت آمیز کہانیاں بڑے مزے لے لیکر اس طرح سناتے جیسے وہ خود اس کے ہمراہ ہوں۔ پھر ہی کہانیاں ہمیں دہرائی پڑتیں اور نصیحت کا جو پہلو ان میں پوشیدہ ہوتا وہ ناظر صاحب کو بتلانا پڑتا۔ اور یہ اہم بات ہم سب چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھ کر ناظر صاحب کے آگے پیش کر دیتے۔ ناظر صاحب ان پرچیوں کو دیکھ کر غمیر جے دیتے اور غمیروں کے اعلان کے بعد اس دن کی حکومت زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچے کو سونپ دی جاتی۔ ناظر صاحب پرچیوں کی جانچ کرتے وقت بچے کی عمر اور اس کی علمیت کے پیش نظر بڑے فراغ دل ہو جاتے۔

اردو نازسی کے سلیس اشعار وہ ہمیں یاد کراتے۔ پھر بیت بازی کے مقابلے ہوتے۔ جو ٹیم جیتی ہوئی ہوتی اس میں بھی جس نے سب سے زیادہ شعر سنائے وہی اس دن کا صدر چنا جاتا جس کو شاہ امروز کا نام دیا جاتا۔ جیتنے والی ٹیم کی ہوتی تو وہ ملکہ امروز بنتی۔ اور اس کا اعزاز یہ ہوتا کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں سات چاکلیٹ اس کو زیادہ دیئے جاتے۔

ناظر صاحب ہمیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجبوراً وہ اس زبان سے نباہ کر رہے ہوں۔ شاہ امروز کو ابا (King of the day) پکارتے اور ملکہ کو (Queen of the day)

شام کو جب ہم بن سنور کر تفریح کے لئے نکلے ہوئے تو شاہ امروز اور ملکہ امروز کا ابا اور امی سے تعارف کرایا جاتا۔ لیکن ابا نہ کبھی شاہ کو شاہ کہتے نہ ملکہ کو ملکہ وہ ہمیشہ (Queen and King) ہی کے القاب استعمال کرتے۔

ابا انگریزی زبان کے بڑے رسیا تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بچے گٹ پیٹ کریں۔ وہ ناظر صاحب کو تاکید کرتے کہ وہ زیادہ تر ہم بچوں سے انگریزی ہی میں بات چیت کریں۔ ناظر صاحب انگریزی میں بات چیت کرتے تو ایسی بوجھل سی آکٹا جینے والی فصاحت بن جاتی کہ ہم لوگ اس پابندی کے خلاف احتجاجاً بات ہی نہ کرتے۔ سچ پوچھتے تو بات کرنا بس میں نہ ہوتا لہذا کچھ دیر تک خاموشی کا راج رہتا جس کو توڑنے کے لئے ناظر صاحب انگریزی میں ہر ایک کو مخاطب کرتے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہی زبان ہمارے جمیٹوں کا وسیلہ بن جاتی جس میں ہم نے تنہا ناسکھا تھا۔

اسکول بھجوانے سے ابا اس لئے اجتناب کرتے کہ ہمارا عام لڑکوں سے ملنا جلنا انہیں گوارا نہ ہوتا۔ ابا نہ صرف ضلع کے حاکم اعلیٰ تھے بلکہ حکومت کے سربراہ اور وہ امر آکے خاندان سے تھے۔ زندگی کو انہوں نے ہمیشہ بلندی سے دیکھا تھا۔ اتنی بلندی سے کہ زمین کے پیارے بھی انہیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے۔ یہ انداز نظر انہیں ورثے میں ملا تھا۔ بھلا ایسے میں ہمارا عام بچوں سے ملنے جلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسی لئے اسکول کا سارا انصاب ہمیں گھر ہی پر چڑھایا جاتا۔

ایک دن تعلیمی تاش میں زیادہ نمبر حاصل کر کے حسنہ ملکہ امروز

بن گئی۔ اس دن مروجہ اصولوں اور قاعدہ کے مطابق منٹ بھر کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کو بھی ہمیں حسنہ کی اجازت لینا پڑتی۔ سارے بچوں پر غنودگی طاری تھی۔ حسنہ جو میری بہن بنت عم ہے اور ملک امروزی تھی وہ جاگ ہی تھی دوسرے بستروں پر چپے۔ چھوٹا تو واقعی سو گیا تھا۔ بڑا یہ باہر کمرے کی سعی کر رہا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ ناظر صاحب اکرام کر سی پر دراز اونگھ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے سن رکھا تھا کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو اکثر و بیشتر ناظر صاحب جھپٹ کر قریبی کسی مکان میں ہوا آتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ایسے میں بند و خاں باہر کے احاطے میں مشرقی گیٹ کے قریب ہری ہری باڑھ کے پیلوں میں چھپے ناظر صاحب کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور جب ان کے برابر پہنچ جاتے ہیں تو وہ چھپاک سے کوئی شے ان کو دے دیتے ہیں جسے چھپا کر ناظر صاحب روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات مومن بی نے بتلائی تھی اور نبی چیرا سی نے اس کی تائید کی تھی۔

نبی چیرا سی اور مومن بی کی ایک علیحدہ تاریخ ہے۔ بلکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صرف مومن بی کی ایک علیحدہ تاریخ ہے اور نبی صاحب تو صرف تاریخ کا ایک باب ہیں۔ مومن بی بالکل نیلے رنگ کا ایک ایسا چمکدار کوہیلا تھیں کہ دھوپ کی کرن پڑنے سے اس کوٹے میں رنگ روپ کی جو دنیا چھپی رہتی ہے وہ سطح پر ابھر آتی ہے۔ دھوپ کی اسی کرن کی طرح ہر نوجوان چیرا سی پہرہ دار اڑدلی اند گھڑ سوار نے پہلی نظر پھینک کر ہی روپ کی وہ چھایا مومن بی کے انگ پر دیکھی کہ سارے منہ میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ مومن بی کا طوفانی شباب تھا تو انہوں نے بڑھ کر نبی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بس اس وقت سے

نبی صاحب مرتے دم تک خاموشی سے خدمت انجام دیتے رہے تھے۔

مومن بی چچی اماں کی باندی تھیں۔ بندو خاں کو رجھانے کی ساری عشوہ طرہ کیا بے کار ثابت ہوئیں تو وہ ان کی مخالف ہو بیٹھیں۔ بندو خاں کو دھکا پہنچانا بے چاری مومن بی کی بے بضاعتی کے بس میں تو تھا نہیں بس جو کچھ تھا سوالن کے ناز نخروں کے بس میں تھا۔ جب وہ انھیں اس جادو سے بھی رام نہ کر سکیں تو انتقامی جذبے کے تحت اندر اندر ملگتی رہیں۔ لیکن بندو خاں کے خلاف کھلے بندوں آواز اٹھانے کی ان میں ہمت نہ تھی۔ غصوں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر ہم بچوں کے کان بھرنے شروع کئے۔ پہلی بات جو بندو خاں کے بارے میں ہمیں بتائی گئی تھی۔ وہ یہی تھی کہ بندو خاں اور ناظر صاحب آپس میں مل جل کر آہستہ آہستہ گھر کا سامان بار کر رہے ہیں اور اس طرح ہمارا گھر اجاڑ کر وہ اپنا اپنا گھر بنانے کی نگر میں ہیں۔

ناظر صاحب کے مزاج کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جو غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہ آتا۔ اچھی اچھی باتیں کرتے کرتے لطائف اور چٹکے بیان کرتے کرتے کبھی بھی وہ یک لخت مٹ کے پتلے کی طرح خاموش ہو جاتے۔ ہماری محفل میں رہ کر بھی دیا ہماری محفل میں نہ ہوتے۔ یوں لگتا جیسے کسی یاد آنے والے کو بھلا رہے ہوں۔ آج حسنہ ملکہ امر دتھی تو اس نے پہلے تو مٹ مٹ ناظر صاحب کی طرف شریر نظروں سے دیکھا جو غنودگی کے عالم میں آرام کر رہی پر دراز تھے پھر اس نے نظروں ہی نظروں میں مجھے اپنے قریب بلایا۔

بیٹیا۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ آج دیکھتے ہیں کہ ناظر صاحب کتنا جانتے ہیں۔ میں نے بھی دلچسپی لی۔۔۔ واقعی آج ہی ہم سر کر لیں کیونکہ ملکہ امر دتھیں اپنے ساتھ۔۔۔ میں نے سوچا۔

لیکن ناظر صاحب اپنی کرسی پر سے جیسے اچھل پڑے۔ کسی نے برف
 کا ٹھنڈا پانی جیسے چھپاک سے ان کے منہ پر دے مارا ہو۔ انہوں نے سامنے
 لگی گھڑی پر اس طرح نظر ڈالی جیسے ٹرین چھوٹی جا رہی ہو۔ اور ہم سے
 کہنے لگے ہم فوری سو جائیں۔ حسہ کی تنبیہ بھی انہوں نے کی۔ کہا کہ آج ملکہ
 ہو کر تم نے نہ انھیں وقت پر سو جانے کا حکم دیا نہ خود بستر پر گھسے۔

حسہ ادیں اپنے اپنے بستر پر بھاگے اور دھڑام سے گر کر بس
 منٹ بھر میں یوں بے سدہ ہو گئے جیسے آنکھ لگے دیر ہوئی ہو۔

ہم نے دیکھا ناظر صاحب چوروں کی طرح ہال میں پھلتے پھتے دو منٹ
 میں تین بار انہوں نے گھڑی دیکھی۔ پھر ہم لوگوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے
 سوئے ہوؤں پر چادر اڑھا رہے ہوں اور یہ جلتے ہوئے بھی کہ ہم لوگ سوئے
 نہیں ہیں دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گئے اور احتیاط سے پردہ برابر کر دیا۔
 حسہ بجلی کی سرعت سے اٹھ بیٹھی۔

میں نے کہا بنگلی "لیٹ جا"۔ ہو سکتا ہے وہ پردے کی اوٹ سے
 ہمیں دیکھیں۔ دیکھا جائے گا۔ حسہ نے تن کر کہا۔ مگر بھیا ذرا تیز سے بات
 کرنا۔ تم ملکہ سے بات کر رہے ہو۔

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ آج اس سے ملکر رہنے ہی میں عافیت
 تھی۔ "معاف کر دو ملکہ"۔ میں نے کہا۔

"کرتے ہیں"۔ اس نے اختصار سے کام لیا۔ بالکل شہزادوں
 کا انداز تھا اس کا۔

کیا یاد کرے گی۔ میں نے دلہی دل میں سوچا۔ سہہ لیں گے اس کی اگر پھول
 آج۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ناظر صاحب جا چکے ہیں تو میں نے حسد سے پوچھا : کیا حکم
 ہے ملکہ امروز۔

پلنگ سے اترتے ہوئے اس نے کہا۔ چلتے ہیں۔ اور بڑی تمکنت سے
 بدے تک آ کر رک گئی۔ پھر ٹھٹھک کر مجھے بلایا۔

”بھیا مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، پہلے تم جا کر ذرا دیکھ آؤ ناکہ سب بڑے لوگ
 نہاں ہیں۔ سونے کے وقت گھومتے ہوئے پکڑ لئے گئے تو پٹائی ہوگی،“
 ”اور اگر میں پکڑا گیا تو؟“

”تمہارا کیا ہے۔ تم عام آدمی ہو۔ میں تو ملکہ ہوں نا۔“
 ”باپ رے۔ یہ بات ہے“ میری زبان سے نکلا۔

”ہاں ہاں بالکل یہی بات ہے“ وہ تنک کر بولی ”وقت پڑے تو تمہیں
 بڑا بھی سکتی ہوں کہ میں نے کام سے بھیجا تھا“

میں نے اس کی بات کی اہمیت کو محسوس کیا۔ واقعی آج وہ یہ سب
 نہ کر سکتی تھی۔ آج وہ ایک صاحب اقتدار ہستی تھی۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور پردہ
 نکا کر جے پاؤں باہر نکل گیا۔

صحن میں پہنچ کر باہر کے احاطہ میں گھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ
 رہا ہوں کہ کسی نے کھکارا۔ آواز میں نے پہچان لی۔ امی نہیں تھیں۔ جو اس ٹھکانے
 رے تو میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چچی امی، چچا ابا کی اچکنیں تہہ کرنے میں محو
 ہیں۔ ان کے کھکارنے کا تعلق قطعی مجھ سے نہیں تھا۔ بس وہ اپنے کام میں مصروف

تھیں اور اپنی آواز کی نزاکتوں میں گم، کچھ گنگنا رہی تھیں کہ شاید حلق میں پتی آگئی۔
چچی امی کی آواز بڑی مسرہیلی تھی وہ اکثر گنگنائی رہتیں۔

میں نے جی ہی جی میں سوچا۔ انھیں کی ذہن نیک اختر کے احکام کی تعمیل کر رہا
ہوں۔ وہ کچھ کہیں گی تو انھیں بتلا کر خوش کر دوں گا کہ آج حسنہ ملکہ امر دہے اور
میرے لئے اس کی ہر بات مان لینا ضروری ہے۔ لیکن چچی نے جب ادھر کوئی توجہ
ہی نہ کی تو میرا جی چاہنے لگا کہ وہ ادھر توجہ کریں۔

ویسے حسنہ ملکہ ہونے کے باوجود بھی اپنے دائرہ اقتدار و اختیار سے
باہر نہیں جاسکتی تھی۔ مثلاً وہ اس کی مجاز نہ تھی کہ کٹری دوپہر میں جبکہ چلیلائی دھوپ
سے ہر ذی نفس پناہ مانگ رہا ہو کسی بھائی یا بہن کو چیرا سیوں کے کمرے تک بھی یہ
کہہ کر بھجوائے کہ ریوڑیاں منگوا دو یا لال لال تیرھی تیرھی، میٹھی تھیں۔ یا بوڑھی کے بال
یا تل کے لٹولیں کہ یہ بات طے تھی کہ جلنے والا پکڑا جاوے اور اس بات کا انکشاف
کرنے کہ وہ آج کی ملکہ یا آج کے شاہ کے کام پر جا رہا ہے تو اس سے کچھ پوچھنا چھ
نہ ہوتی۔ شاہ کو جب ملکہ یا شاہ کا بزرگوں سے تعارف کرایا جاتا تو اس کے دور
حکومت میں جس بے راہ روی کو اس نے روا رکھا تھا۔ اس کی نسبت استفسار کیا
جاتا۔ تنبیہ کی جاتی تھی اور اگر جرم سنگین ہوتا تو ایک ہفتہ تک ملکہ یا شاہ کو معزول
کر دیا جاتا وہ اس طرح کہ اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت وہ دو ایک ہفتے کے
اندر ملکہ امر و یا شاہ امر و بن سکتا تو بھی نہ بنایا جاتا۔

بہر حال یہ کہ میدان صاف تھا۔ اور ملکہ حسنہ بغیر کسی پابندی کے باہر نکل
سکتی تھی سو میں نے پیگ کو اس کو اطلاع دی لیکن وہ مانی نہیں۔ چچی امی سے وہ

ڈر رہی تھی۔ طے ہوا کہ میں اسے اپنی آڑ میں اوٹ کی طرح چھپا لوں گا۔ لہذا ہم پیر دبا کر پنجوں پر چلتے ہوئے اس طرح باہر کے احاطے تک آپہنچے جیسے ماری دنیا اپنا سب کچھ تیاگ کر بس ہماری ٹوہ میں لگی بیٹھی تھی۔ باہر کی کھلی فضا میں سانس لیکر ہمیں چلچلاتی دھوپ کا احساس ہوا نہ پتی ہوئی زمین کا۔ ننگے سر ننگے پاؤں ہم تو ہم پر چل پڑے تھے۔ احاطے کے بے نیچے کی کچھلی گیت تک نیچے کے لئے پہرہ بیٹھک سے ہو کر گذرنا تھا۔ بیٹھک میں بنی صاحب ہوئے تو کوئی ت نہیں مومن بنی کے نام کی دہائی ان کے لئے کافی تھی۔ لیکن کوئی دوسرا ایسا جیسے وہ بھینڈی چاؤش جس نے ابائے، جب وہ شروع شروع اس لمحے پر آئے تھے تو کہا تھا کہ میں سپاہی بچہ ہوں کر سی نہیں اٹھاؤں گا۔

تو دراصل یوں ہوئی تھی کہ ابائے برسرِ اجلاس اس کو حکم دیا تھا کہ کمر سی

ملاؤ۔

چھوٹے ہی بھینڈی چاؤش نے جواب دیا کہ میں سپاہی بچہ ہوں، یار ابد بدوق اٹھاتا ہوں کمر سی نہیں اٹھاتا۔

ابائے عدول حکمی کی یادداشت میں ایک جہینہ کے لئے اسے معطل دیا۔

مئی پہلے آپ کو بھینڈی چاؤش کی اصطلاح اور خصوصیات سمجھاتا ہوں۔ حیدرآباد کی نظام حکومت میں اکثر و بیشتر خزانے کے پیروں پر درباروں کے پیروں پر ایسے عروب متعین تھے جو عربستان سے آکر یہاں رہ بس گئے تھے۔ شملہ اور تہہ بند باندھتے تھے۔ خنجر تہہ بند میں اڑس رکھتے تھے۔ اس خنجر کے

بل بوتے پر ان کی شجاعت اور بہادری کے افسانے زبان زد خاص و عام ہوتے ان عربوں کا دیکھا دیکھی یہاں مقامی باشندوں نے بھی اس طرح کی ملازمت سے وابستہ تھے۔ تہند باندھکر بنجر اڑس دکھنا اپنا شعار گردانا — وہ اردو بات عربی لہجے میں کرتے اور اس تقلید پر فخر محسوس کرتے — ان کی اس گراوٹ پر لوگوں نے انھیں ”بھینڈی چاؤش“ پکارنا شروع کیا۔ بھینڈی چاؤش کی نسبت میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ آپ بھی نہ جانتے۔ ہاں ایک اضافہ چاؤش کے ساتھ لچھو کا بعد میں ہوا۔ یہ لچھو پس ماندہ طبقہ کی پڑی جھڑی ایسی عہدت کا سنبل ہے جو چاؤش کی داشتہ بنکر اس کے ساتھ رہنے میں اپنی توقیر سمجھتی ہے۔ پھر اس لچھو کے لئے عربوں نے ایک دوسرے کو قتل بھی کیا۔ خون خرابے بھی ہوئے۔

ہاں توجہ اتانے پرے کے اس بھینڈی چاؤش کو معطل کر دیا تو اس نے معذرت خواہی کی اور انہوں نے اس شرط سے معاف کر دیا کہ وہ کرسی سر پر اٹھا کر دفتر کے اطراف احاطے میں چکر لگائے۔ بھینڈی چاؤش نے تعمیل کی۔ اس کی لچھو نے خوب ہنس ہنس کر اس کو چھڑا جب وہ کرسی سر پر اٹھائے چکر لگا رہا تھا۔ پھر سزا کی معافی کی خوشی میں دونوں نے جی بھر کر تارڑی پی۔ یہ بات بھی ہم نے سنی۔

اب یہ بھینڈی چاؤش کچھ ایسے وفادار ہوئے کہ انہوں نے ہم بچوں کو بھی بے وقت گھر کے باہر دیکھا تو کبھی نہ بخشا۔ اور ابا سے شکایت کی۔ اللہ کی یہ کرنی ہوئی کہ اس وقت پہرے پر یہ وفا شعار نہ تھا۔

اور حسنہ بچنے کی کھلی گیٹ پر عین اس وقت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
 بلکہ بندو خال واقعی کوئی شے بستی میں چھپا کر ناظر صاحب کو دے رہے تھے اور
 ناظر صاحب اسے لیکر تیزی سے روانہ ہو گئے تھے۔
 حسنہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ — دیکھا بھیا مومن بی سچ کہتی

ہیں نا۔ —

مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا۔ جو دکھ مجھے اس وقت ہوا تھا اس کا احساس
 ایک ذہن میں جیسے کہیں چھپا بیٹھا ہے اور اس کیفیت کی یاد دلاتا ہے جو
 پرطاری ہو گئی تھی میرا تو اس وقت جی چاہا تھا کہ روپڑوں۔ اس کی وجہ شاید بندو
 کی ایذا داری کا وہ تصور تھا جو باا اور امی کے رویے سے امانتاً ہم تک
 پاتا تھا۔ اور آج ساری بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ میں نے جھو جھری لی اور
 ہوش میں آتے ہی حسنہ کی ہانہ میں چپکی بھر لی۔
 ”کیوں نوچتے ہو بھیا“

دیکھ کیا رہی ہے۔ چپل بھاگ چلیں۔ بندو خال نے دیکھ لیا تو

مقاماً۔ —

لیکن اس نے میری پوری بات سنی نہیں۔ بگڑ کر بولی۔
 ”بھولتے کیوں ہو کہ میں ملکہ بھی ہوں۔ صرف حسنہ نہیں ہوں۔“
 جی چاہا اگر دن پھر کر اس کو بندو خال کے آگے ڈھکیں دوں جو
 بہتہ آہستہ اب گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن مجھے اپنی بھی تو
 برمنانی تھی۔ گھنی بارڈھ کی اوٹ میں چھپے ہم بندو صاحب کو نظروں سے

اوجھل جوں تک دیکھتے رہے۔

لیکن جب جھکے جھکے دب کر ہم باڑھ کی اوٹ میں گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے مجھے گمان ہوا کہ بندو خاں نے ہمیں اس مقام پر دیکھ لیا ہے جہاں باڑھ کچھ نوکھ گئی تھی اور اتنی گہری نہ تھی۔ میں نے حسہ کو ٹوکا۔

”ملکہ امروز“

”ہاں جی۔“

”راستہ خاص سے بھاگ چلیں“ — یہ وہ راستہ تھا جہاں سے ملازمین کو آمد و رفت کی اجازت نہ تھی لیکن ہمارے کمرے میں پہنچنے کے لئے یہ قریب ترین راستہ تھا پر اتنا ہی کٹھن بھی۔ کٹھن اسلئے کہ ابا اور انی کے کمروں کے بالکل پاس سے ہو کر ہمیں گزرنا پڑتا تھا۔

ملکہ نہیں مانی۔

میں نے کہا — بندو خاں تعاقب کر رہے ہیں۔

اب اگر ہم اور آگے بڑھتے تو یہ راستہ پیچھے جھوٹ جاتا تھا۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا حسہ (اب میں پھر بھول گیا تھا کہ وہ ملکہ بھی ہے) دیر مت کرو — اور ہم دونوں بھاگے۔ میں نے دیکھا ملکہ ابا کی پشت سے ٹکرا گئی ہے تو دفتر سے غالباً قبل از وقت لوٹ گئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے میں خود کو دھواڑے کی اوٹ میں چھپا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے حسہ کی وہ نگاہیں بھی نہیں بھولتی ہیں جن نگاہوں سے اس نے مجھے اس وقت دیکھا تھا۔ اب جو میں بکسٹ بھاگا تو بندو خاں کے بالکل مقابل

تھا۔ لیکن اس وقت میں ایک ایسے بڑے حادثے سے بچ کر نکل آیا تھا کہ بندو خاں اپنے تن و توش کے باوجود مجھے کچھ ٹھکنے ٹھکنے سے بونے بونے سے لگے۔ غیر شعوری طور پر میرا ذہن ان سے خوف کھانے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کے درپے تھا۔ شاید میں کچھ اس طرح سوچ رہا تھا کہ میں ریل کے انجن سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا ہوں اور کسی بچے کی ٹرائیکل سے ٹکرا گیا ہوں۔

لیکن حسہ بیچاری — بد نصیب ملکہ

بندو خاں نے رعب کسا — میں نے دیکھ لیا ہے بابا۔

مجھ میں بھی تو کوئی باغی جاگ گیا تھا — میں نے جواب دیا۔ میں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا ہے بندو خاں۔

کیا دیکھ لیا ہے — بندو خاں ذرا سا چونکے۔

”یہی کہ تم ناظر صاحب کو چھپا چھپا کر کچھ دیتے ہو۔“

”کچھ کیا دیتا ہوں — کھانا دیتا ہوں — سونا چاندی نہیں دیتا۔“

کھانا دیتے ہو؟ — یہاں انہیں کھانے پینے کی کوئی کمی ہے! مجھے ایک اور دھچکا سا لگا — بندو خاں کی بڑائی ایک سیاہ دھبہ بنکر میری نظروں میں سمٹ گئی۔ میں کچھ دیر پہلے ان کے تعلق سے مشتبہ ہو گیا تھا اب یہ بات تو اور بھی کھل کر رہ گئی کہ وہ چوری بھی کر رہے ہیں اور سینہ زوری بھی۔

لیکن بندو خاں نے بڑی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا — یہ بات کسی کو بتلانا مت وہ کہنے لگے — میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔

میں اب زیادہ وضاحت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ

میرا سانس ٹھیک ہو رہا تھا اور میں نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے پھر وہی نکر دامن گیر ہوئی کہ اپنے گوشہ عافیت میں محفوظ رہنے جاؤں سو میں مزید کچھ بندو خاں سے کہے بنا چل دیا۔

ملکہ جب کمرے میں لوٹی تو بہت سہمی ہوئی تھی اور ہانپ رہی تھی یحسان ٹھیک کر کے اس نے کہا — چچا ابانے کچھ نہیں کہا — صرف اس قدر پوچھا کہ آج کنگ کون ہیں۔

میں نے کہا کہ جی میں ہی کوئین ہوں۔ اس پر انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں اب تک کانپ رہی ہوں۔

شام کو ملکہ امروز حسنہ ایک ہفتے کے لئے معزول کر دی گئی۔

لیکن میرے لئے اس واقعہ سے بڑا ایک حادثہ پیش آیا — میں حادثہ اس بات کو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس بات نے میرے لئے زندگی کو سمجھنے کے کچھ راستے متعین کئے۔ اور میں نے اپنی کم عمری میں سب سے زیادہ اسی بات پر سوچا اور غور کیا تھا۔

بندو خاں نے مجھے بتایا کہ ناظر صاحب کی اکلوتی بیٹی یہیں ضلع میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔ مصلحتاً انہوں نے ابا اور امی کو یہ بتا دیا تھا کہ بچی کو انہوں نے اپنے وطن کا منور بھجوا دیا جہاں ان کی بہن ہے۔ سچ پوچھئے تو ناظر صاحب کا سوا اس بچی کے اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے اس جھوٹ کو گھڑنے کی ضرورت کیوں محسوس کی مجھے یاد ہے مجھے اس جھوٹ نے بے حد صدمہ پہنچایا تھا — ابا پر اس بات کا انکشاف ہوتا کہ ناظر صاحب

کی کوئی لڑکی بھی ہے تو وہ ہر طرح اس کی دست گیری کرتے — چھپے چوری تین وقت کے کھانے کے لئے ناظر صاحب نے اپنی اہمیت کو اس قدر گھٹا لیا تھا جبکہ ہر چیز ان کے بس میں تھی۔ یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہ آئی — اسی لئے میں نے بندو خاں کی سب کچھ سنکر انھیں ایسی تکھی نظروں سے دیکھا کہ وہ جان گئے کہ میں ان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا ہوں۔

کچھ دیر سوچ کر بندو خاں نے مجھے قریب کر لیا۔ پھر بڑی شفقت سے ہنسنے لگے۔ بابا کجواب میں ٹاٹ کے پیوند نہیں لگتے۔ صاحب کو معمولی گھرانوں کے ذل سے آپ لوگوں کا ملنا جلنا پسند نہیں ہے۔ ناظر صاحب کی اکلوتی بیٹی انھیں بہت یار ہے، وہ اسے یہاں لاتے ہیں تو وہ روز ہی یہاں آنے کے لئے ضد کر سکتی ہے۔ ناظر صاحب کی حاضری یہاں ہر روز ضروری ہے۔ اپنی بچی کے ساتھ آنا اگر صاحب برابر معلوم ہو تو۔ ادب اب یوں بھی بچی بڑی ہو رہی ہے۔ پھر بندو خاں کہنے لگے آپ کا گھر برا گھر بھی ہے بابا، میں کوئی سونا چاندی نہیں لٹا رہا ہوں۔

بات میری سمجھ میں تو آگئی تھی۔ لیکن میں اپنے نیم نچتہ شعور کے باوصف کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیا ہم اس زمین پر نہیں رہتے۔ کیا ہم اتنے بلند ہوئیں کہ زمین پر رہنے والے ہمیں چھوٹے دکھائی دیں۔

میں نے بندو خاں سے وعدہ کیا کہ یہ راز میں کسی کو نہیں بتلاؤں گا۔ اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ قصہ پارینہ ہوا۔

لیکن آج کی رات تو بھیا نک حد تک تاریک تھی۔ آج کی رات تو اکیلیاں اس طرح برس رہی تھیں جیسے پھر رسنے کا نام نہ لیں گی۔ بجلیاں اس طرح

چمک رہی تھیں جیسے تارکی کے ہر تصور کو نابود کر کے رکھ دیں گی۔ گرج اور کرطاکے ایسے تھے کہ زمین کی بے بسی پر آسمان دھاریں مار کر روتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ناظر صاحب ہم بچوں کے جھرمٹ میں آنکھیں بند کئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر سے اس طرح چونک اٹھتے تھے جیسے بجلی انھیں چھو چھو کر گزر رہی ہے۔ بچے اونگھنے لگے۔ یہاں تک کہ سب سو گئے۔

میں نے ناظر صاحب سے کہا۔ ”مولوی صاحب آپ چلے جلیے۔ آپ کی بیٹی اکیلی ہو گی۔“

انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی بچہ ماں کے بطن سے ابھی ابھی دنیا میں آیا ہو۔

میں نے پھر کہا۔ میں سب جانتا ہوں مولوی صاحب۔ میں کسی کو نہیں بٹھاؤں گا۔

ناظر صاحب میری پیشانی پر جھکے۔ میں نے ان کے ہونٹوں کی حدت اور آنسوؤں کی نرمی دونوں ہی اپنی پیشانی پر محسوس کی۔

پھر اٹھ اٹھے اور طوفانی بارش میں گر جتے بادلوں میں چمکتی بجلیوں میں اس تیزی سے چل پڑے جیسے ان کے اندر کے طوفانوں کے آگے یہ سب کچھ سچ ہو۔

ادھورا سوئٹ ط

مونانے جب مجھ سے یہ کہا تھا کہ کبھی آپ کو مجھ پر بھی کہانی کہنی ہوگی
تو میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

مونانے ایک معمولی صورت کی غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت کو پرکشش
بنانے میں اس کی مسکراہٹ اور اس کی چال کو بڑا دخل تھا۔ چلتی اس طرح تھی جیسے
دیکھنے والوں کے دلوں پر قدم رکھ رہی ہو اور مسکراتی اس طرح تھی جیسے پوچھ رہی
ہو کہ کیوں کیسے پامال کر کے رکھ دیا ہے۔

جو لوگ اس کی چال کی زد میں آجاتے وہ اس کی مسکراہٹ کے سہارے
بٹھل بھی جانے کی کوشش کرتے لیکن اپنا توازن کھو بیٹھتے۔ مونانے اتنی سفاک بھی نہ
تھی کہ اسے ان ساری باتوں کا علم تک نہ ہوتا۔ وہ بھانپ جاتی لیکن اس حادثے کو اپنی
خوش فہمی سمجھ کر وہ ہر اس پسندیدگی کی نفی کرنے لگتی جو نظروں میں اسے

پیش کی جاتی۔

”مجھ میں ہے ہی کیا۔ میں کہاں جا۔ ہے جانے کے لائق ہوں۔“ وہ آئینہ سامنے رکھ کر سوچتی اور یوں ادا اس ہو جاتی جیسے اس کی اپنی آنکھیں اس کے حسن کا جائزہ ان نظروں سے کبھی نہ لے سکیں گی جن بیکوار نظروں سے لفظیٹ ولید نے ہاتھ پر پٹی بندھواتے وقت آبریش تھیسٹر میں لیا تھا۔

جب پٹی باندھ کر وہ اسے وارڈ میں بستر تک لے آئی تو بستر پر لیٹے ہوئے ولید نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ“

وہ اسٹول کھینچتے ہوئے مکرانی تھی اور بیٹھ گئی تھی۔ ولید نے ٹنگلی باندھ کر منٹ بھر اس کو دیکھا تھا۔ مونا بدستور مکرانہ ہی تھی۔

”میرے بچوں کی ماں بنو گی؟“ — ولید نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا تھا۔

مونا کی مکرانہٹ یوں غائب ہوئی جیسے گھرے ہوئے بادلوں میں چاند ڈوبتا ہے۔ وہ اس طرح خاموش رہی جیسے خود کو بت سمجھ بیٹھی ہو۔

بتاؤ مونا۔ ولید۔ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس نے مونا کے دونوں بازوؤں کو اتنی قوت سے دبا یا کہ اسی کے زخمی ہاتھ کی پٹی میں سے خون نکلنے لگا لیکن مونا خاموش رہی۔ جب لفظیٹ ولید کے ہاتھوں کی گرفت مونا کے بازوؤں پر یہ جان کر کم

ہو گئی کہ مونا رو رہی ہے تو یکایک اٹھ کھڑی ہوئی۔ تڑپ کر ولید کی گرفت سے نکلی اور اپنی آنکھوں پر دستی رکھ کر تیز تیز دارڈ سے چلی گئی۔
ولید نے چاہا کہ اس کا پیچھا کرے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

”وہ آئے گی۔“ وہ اپنے بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دیڑھ گھنٹے بعد اسے پھر انجکشن لگائے گی۔ پگلی کہیں کی۔ ولید نے بڑے پیار سے سوچا پتہ نہیں کیا الٹا سیدھا کچھ بیٹھی ہے اتنی پیاری پیاری باتیں کرتے کرتے یوں خاموش ہوئی ہے جیسے میں کوئی ناگ ہوں جس نے اس کی چاندنی جیسی مسکراہٹ کو ڈس ایلے۔ لیکن کیا کوئی اس کا منگیتر ہے۔ جس کو وہ چاہتی ہے؟ نہیں یوں ہوتا تو اس کو رونے کی کیا پڑی تھی! تو پھر کیا وہ بیاہتا ہے؟

”اور لفٹ ولید بیکار ہوا اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چپکے سے اٹھ کر نرسز لاؤنچ میں پہنچ جائے۔ لیکن وہ وہاں اکیلی نہیں ہوگی۔“ یہ سوچ کر اس نے کروٹ بدلی اور اس سمت دیکھتا رہا جس طرف وہ گئی تھی۔ گردن جھکائے دستی آنکھوں پر رکھے۔

یہ دیڑھ گھنٹہ ولید نے انتہائی بے قراری کے عالم میں گزارا۔
ٹھیک وقت پر وہ پھر سرخ اور سوئی لمٹھ میں لئے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی۔ خوشی کے مارے ولید کا چہرہ دمک اٹھا۔

جب وہ بالکل پاس آگئی تو چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر اس نے سرخ کی سوئی کو اوپر اٹھا کر سرخ کا پمپ دبایا اور تھوڑی سی دوا سرخ سے خارج

کر کے ولید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”میں انجکشن نہیں لوں گا“

نہ لیجئے۔ بلکہ ہو سکے تو ڈی۔ ایم۔ او سے شکایت کر دیجئے کہ نرس بڑی
لگ چڑھی ہے۔ مسکراتا تو جانتی ہی نہیں۔ دو مہینے کی سرویس میں یہ چوتھی شکایت
ہی۔ شاید فوجی ہسپتال میں یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

میں تمہارے ڈی۔ ایم۔ او کو کیا جانوں۔ مجھے جو کچھ شکایت کرنی ہے۔
وہ تم ہی سے کرنی ہے۔ مجھے بتاؤ آخر تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟
اگر مجھے اس طرح ہر بات کو سچ سمجھنے کی عادت ہوتی تو میں پہلے حادثہ
میں آپ سے بہت بڑے فوجی افسر کی کچھ ہو گئی ہوتی۔

مگر یہ زیادتی ہے۔ مونا۔ سچ اور جھوٹ کا فرق کرنے میں جب آنکھیں
بھک چوک جاتی ہیں تو پھر دل اس فرض کو پورا کرتا ہے۔ تمہیں اب اپنے دل سے
بوچھنا چاہیے۔ میں یہاں ہوں میں جانتا ہوں کہ محبت کے اظہار کا بڑا کرڈ طریقہ
میں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح طریقہ اظہار کوئی
نہیں ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے یہ چاہے کہ وہ اس کے بچوں کی ماں بنے
اور پھر تم یہ بھی تو سوچو کہ میرے پاس وقت کہاں ہے۔ کہ میں تمہارے حسن کی
تعریف کروں۔ اپنی محبتوں اور وفائوں کے پے درپے امتحان دوں۔ اپنے لئے تمہارے
دل میں اتنی جگہ پیدا کروں کہ مجھے چھوڑتے وقت تمہاری آنکھیں نم ہو جائیں اور جب
چھوڑ چکو تو پھر تم سو بھی نہ سکو؟ اس ایک گھنٹہ کی رفاقت میں تم مجھے اتنی پیاری
لگی ہو کہ میں وقت ملنے پر تمہارے لئے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ جو ایک

چلنے والے سے اس کی محبوبہ چاہتی ہے۔ لیکن مونا میں محاذ سے لڑنا ہوا سپاہی ہوں۔ میں بڑا بے بسی تھا۔ جس وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ سپاہی کے لئے اس کے ہاتھ اور اس کی آنکھیں سب سے زیادہ اہم ہیں تاکہ وہ آخری سانس تک دشمن سے لڑ سکے۔ کل پھر مجھے اسی ہاتھ کی توانائی کا امتحان لڑائی کے محاذ پر لینا ہے جس ہاتھ نے تمہیں گرفت میں لینا چاہا تو اس سے خون رس رہا تھا۔ مونا نے اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر لفٹ ولید کو غور سے دیکھا ”تو کیا آپ واقعی مجھ کو اپنے قابل سمجھتے ہیں۔“

مونا یہ سوال تو مجھ سے کرنا چاہیے تھا کہ کیا تم مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتی ہو جو اس طرح پس و پیش کر رہی ہو؟۔

”لیکن“

میں جانتا تھا کہ تم اس دیوار کی بات اٹھاؤ گی جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے اینٹ اور گارا دیکر اونچا کر لیا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھو مونا کہ نہ تو کسی محبت کا کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کسی سپاہی کا۔ وہ شے جو موت کو زندگی کا ایک کھیل تصور کرتی ہے وہ بھلا ان چھوٹی چھوٹی دیواروں سے لڑے گی۔؟

مونا نے اب کی بار ایسی نظروں سے ولید کو دیکھا کہ اس کا پیار چھیلے نہ چھپتا تھا۔ اچھا اب انکسشن تو لگو لیجئے مونا نے ولید کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ پہلے میری بات کا جواب دو“

ولید نے بازو ہٹاتے ہوئے بھی چھڑ لیا کہ مونا ہنس رہی ہے اور یہی

ہنسی و مٹھے تھی جس کے لئے وہ مضطرب تھا۔ آج سے آپ کی ضد نہیں میرا حکم چلے گا۔

”سج“ ۱۔ ولید نے قریب قریب بستر پر اچھل کر پوچھا اور جب مونا اس کے قریب آگئی تو اس نے پلنگ پر بیٹھتے بیٹھتے اپنا سر مونا کے سینے پر رکھ دیا اور جب مونا نے اسے انجکشن لگایا تو وہ مونا کی محبت کے آگے بالکل بچہ سا معلوم ہو رہا تھا جیسے مونا کی محبت میں شفقت کا بھی عنصر شامل ہو۔

دو دن بعد لفٹ ولید کو ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا کیونکہ وہ صحت مند ہو گیا تھا۔ مونا کی دور روز کی رفاقت نے لفٹ ولید کے سینے میں دلولوں کا ایسا جوالا مکھی بھر دیا تھا۔ اس نے جب بھی مونا کی پیشانی کو چومنا مونا نے اپنے سہاگ کو دعائیں دیں کیونکہ مونا نے ولید کو اب اپنا سب کچھ مان لیا تھا اور اس محاذ پر واپس چلے جانے کے تصور سے ہی کانپ کانپ جاتی تھی۔ اس خوف کو اس نے سو سو طرح ولید سے چھپایا لیکن باتیں کرتے کرتے بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

ولید اسے تسلیاں دیتا۔ کھل تم ایک بہادر سپاہی کی بیوی بن جاؤ گی مونا اور پھر اس کے بچوں کی ماں تمہیں یہ آنسو زیب نہیں دیتے۔ ہنسی خوشی اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال کر جھول جانا۔ میں ان ہنستے ہوئے ہونٹوں کی چاندنی چرا کر اپنے پاس محفوظ کروں گا تا کہ محاذ جنگ پر جب بھی اندھیرے پڑھیں یہ چاندنی مجھے راہ دکھائے۔ اور وہ مونا کو اس اس طرح گدگداتا کہ وہ ہنسنے پڑتی۔

میں نے مونا کو پہلی بار ولید کے مکان پر اس وقت دیکھا جب وہ سرخ لباس پہنے ولید کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے موڑ میں سوار ہو رہی تھی۔ ولید ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں تھا اور بڑا سبیل لگ رہا تھا۔ وہ ویسے بھی بے حد وجہ اور خوبصورت نوجوان ہے جب اس نے مجھے دیکھا تو آگے بڑھ کر چمٹ گیا۔

”کہاں ہے میرے افسانے“۔ کل ہم دونوں ہی دوبار تمہارے کمرے پر ہو آئے میں نے جھلا کر مونا سے کہا کہ کچھ نہیں تو یہ قفل توڑتا چلوں۔ مونا نے روک دیا ورنہ۔ اچھا ابھی پہلے مونا سے مل لو۔ میں نے ہاسپٹل سے یہ کہانی پک چھپکتے میں یوں چمکی بجا کر اٹھالی ہے۔ اس نے چمکی بجا کر مونا کو میرے قریب کر دیا اور پھر مونا سے کہنے لگا۔ ”یہ ہے میرا وہی دوست نندو جسے میں افسانہ کہتا ہوں۔ اور جس کے لئے میں کل اس قدر بیقرار تھا کہ ہماری خوشی میں شریک ہو سکے۔ لیکن اس کے پیر میں تو چکر ہے۔ جانے کہاں کہاں کہانی کی تلاش میں بھٹکتا ہے۔ اور مجھے دیکھو کیسا چپکے سے اتنی پیاری سی کہانی چرا لایا ہوں۔

مونا نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ مونا ولید احمد جو کبھی مونا جوالا پر شرا دھتی۔ شاید اس کی مکر اسٹ ہی نے ولید کو مارا ہو گا۔ ویسے اچھی بھلی ہے۔ لیکن ولید کی شریک حیات کو تو بے حد حسین ہونا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں ولید کی جلد بازی کو محسوس کیا۔

”اچھا تو تم لوگ وہاں ہو آؤ جہاں کے لئے تیار ہو کر نکلے تھے۔ میں پھر آؤں گا۔“

آج رات تم ہم سے پھر ملو گے۔“ ولید نے گویا حکم صادر کر دیا۔“ میں
مونا کو ان کے دو ایک رشتہ داروں سے ملاؤں میرا تو اس شہر میں کوئی ہے ہی نہیں۔
تم ہی اس وقت میرے دوست اور سرپرست دونوں ہو۔

میں نے موقع کو غنیمت جانا اور تن گیا۔ تو پھر تمہیں اپنے سرپرست سے
بات کرتے وقت آداب و تمیز کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ولید نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ لئے۔ آپ رات کو ضرور تشریف لائیں۔
کہنی مار کر اس نے مونا کو بھی اشارہ کیا۔ مونا نے بھی مسکرا کر ہاتھ جوڑ لئے
کہنے لگی۔ ہم دونوں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔
میں نے بڑی تمکنت کا مظاہرہ کیا اور ہم جدا ہو گئے۔

رات کو میں جب دروازہ کے مطابق پہنچا تو ولید کے کوارٹر کو تالا لگا ہوا
تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ لوگ ابھی لوٹے نہیں ہیں۔
لیکن جب میں لوٹنے لگا تو ایک فوجی سپاہی نے مجھے بتایا کہ دونوں
ارجنٹ آرڈر کی بناء پر انبالہ چلے گئے ہیں۔

دوسرے ہی دن مجھے ولید کا خط ملا۔ اپنے اس طرح یکایک چلے جانے
پر اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ آج کے آٹھویں روز محاذ
پر چلا جائے گا اور محاذ پر جانے تک وہیں انبالہ میں رہے گا کیونکہ ابھی اس کے ہاتھ کا زخم
پوری طرح اچھا نہیں ہوا ہے۔ اور اس کو اپنے ملٹری میڈک کو آرڈر سے کچھ فردی ہدایتیں
بھی لینی ہیں۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد وہیں آجائے گی
اور کو آرڈر میں رہے گی۔ مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کی خبر گیری کروں۔ اور روز

اس سے ملتا رہوں۔

میں نے کامیاب اور فتح مند لوٹنے کے لئے اپنی نیک تمنائیں آنکھیں اور وعدہ کیا کہ مونا کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

اس کے بعد مجھے ولید کی کوئی اطلاع نہیں ملی نہ ہی اس نے کوئی خبر بھیجا۔ نویں دسویں دن جب میں اس کے کوارٹر میں پہنچا تو مونا موجود تھی۔ نے مجھے بتایا کہ وہ اسی صبح آئی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ولید محاذ پر چلے گئے، اس کی آنکھیں شاید دن بھر رونے کے باعث سو ج گئی تھیں۔ وہ مجھ سے بات کرتے کھو جاتی۔ کہنے لگی آپ کے ولید نے مجھ سے جدا ہوتے وقت مجھے فوج کیا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو بے ساختہ ہنس پڑے اور مجھے گد اکر ہنسایا۔ میرا چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں لیکن رونا بھی بس میں نہ تھا۔ آنہ آنکھوں میں آنکھیں سم جاتے تھے۔ رونا بڑا سنگین ہے نا۔ میرا جیالا سیاہی تو جیت کر سینہ تانے سر اٹھائے خوشی خوشی گھر آئے گا۔ پھر یہ آنسو کیسے بہے کیسی بلا ہے جو آنسو بھی چھین لیتی ہے۔ مکر اہٹ بھی۔ وہ کچھ سوچتے ہو خاموش ہو گئی۔

ارے آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ بیٹھ جلیے نا۔ مجھے معاف کر دو میں دراصل ولید کے پھر وہ خود ہی شرمائی۔ اور کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ وہ کہتے تھے کہ آپ بڑے گیانی ہیں۔ کوئی پریشانی ہو تو میں آپ سے مشورہ کرا مجھے کوئی پریشانی نہیں میں تو ولید کی بیوی ہوں۔ جن پر مجھے فخر ہے۔ ”
یہ جنگ بہت جلد ہی رک جائے گی نا۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ کچھ سوچ کر ہنس پڑی۔ پھر خود ہی کہنے لگی وہ بڑے کھنڈر ہے میں بڑا بچپن ہے ان میں۔ ان آٹھ دس دنوں میں مجھے بڑا تنگ کیا حکم دیتے کہ مارچ پاسٹ کروں۔ آپ کو پتہ ہے یہ کس بات کی سزا تھی؟ کہتے کہ تمہاری چال مجھے پیاری لگتی ہے پھر شاید اس نے سوچا کہ میرے سامنے اسے ایسی بات نہیں کر لیا چاہیے اور وہ خود کچھ اس طرح شرمائی جیسے شرم بھی چھپا رہی ہو۔

”چلے بنا لاؤں“۔ وہ اٹھی اس کی چال میں بڑا بانگین

تھا۔

جب وہ کچن میں چلی گئی تو میں نے بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسٹیل کے ایک خوبصورت کتابی چوکھٹے میں ولید کی اور مونا کی تصویریں سجی ہوئی میز پر دھری تھیں۔ پھر میری نظر شیٹے کی اس الماری پر پڑی جس میں ولید اور مونا کے کپڑے مونا نے بالکل نئے ڈھنگ سے جما رکھے تھے۔ ولید کا ہر کپڑا مونا کے کپڑوں کے ساتھ جوڑ کر تہہ کیا گیا تھا۔ کوئی الگ نہ تھا۔ میں اس کے پیار پر مسکرا کر رہ گیا۔ مجھے مونا بڑی پیاری لگی جس نے ولید کو اپنے دل میں سو سو طرح چھپا کر رکھ لیا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر میز پر پڑا ہوا الم اٹھا لیا۔ پہلی ہی تصویر میں جاتے ہوئے سپاہی کی اس کی محبوبہ روک رہی تھی اور سپاہی مسکراتا ہوا ہندوستان کے نقشے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جو اس کی پشت پر تنگا تھا۔ یہ سپاہی ولید تھا اور یہ محبوبہ مونا۔ تصویر میں محبوبہ کا اداس چہرہ اور سپاہی کی پیار بھری مسکراہٹ اور بیک گراؤنڈ میں ہندوستان کا نقشہ بہت

پڑا اثر تھے۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر البم رکھ دیا کہ مونا کے بتانے تک مجھے اس کی غیر موجودگی میں اس کا البم نہیں دیکھنا چاہیئے۔

میں، چپکا سا آکر اپنی جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ ٹرے میں چلے نمکین بسکٹ اور بوندیاں لے آئی۔

چلے کے ساتھ جب اس نے یہ لوازمات پیش کئے تو مجھے ولید بے احتیاء یاد آیا۔ میں طمہ بھر کر مبہوت سا ٹرے کو ٹکٹا رہا۔

”میں جانتی ہوں اس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں“ اس نے مسکرا کر کہا لیکن میں نے غصے سے اس کی مسکراہٹ مرجھا گئی تھی۔ مجھ سے ولید نے آپ کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ ہم ٹرانپنگ کر رہے تھے تو یہ نمکین بسکٹ اور بوندیاں انہوں نے ہی مجھے دلائیں۔ کہنے لگے۔ نندو بھیجا جب بھی آئیں چلے کے ساتھ یہ بھی پیش کروں۔

ولید کا دل کتنی ہی محبتوں کی ایک دنیا بسکے ہوئے ہے۔ میں نے یہ جملہ کہتے ہوئے اپنی از خود رنگی کو چھپا لیا جو الفاظ اور لہجے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ اور خود کو سنبھال کر بے وجہ ہنس پڑا۔

”کیا بات ہوئی اس نے پوچھا۔“

”بہت خاص بات ہوئی ہے۔“

”پھر بتائیے نا۔“

میں نے تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ الماری میں کپڑے رکھنے کا انداز دنیا بھر سے الگ دکھائی دے رہا ہے۔

وہ کچھ شرما کر ہنس پڑی۔ کہتے لگی۔ دیکھئے نا۔ میرے کپڑے میری تصویر
مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ ہر ایک سا جن کے پاس ہے۔ میں اکیلی ان سے کچھ کر
رہ گئی ہوں مجھے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے میں نے جی بھر کر ولید کو دیکھا بھی نہیں۔ ”اُس
کا گلارندہ گیا تھا۔ وہ جو ابھی ابھی ہنس پڑی تھی۔“
اُس نے کہا۔ ”مجھ پر بھی کہانی لکھئے۔“

میں مسکرا دیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں میں موناکو میں نے پہلایا۔ اس کو
مشورہ دیا کہ وہ کل سے ڈیوٹی پر جانے لگے تاکہ مصروفیت میں اس کا دل بھلا رہے۔
”وہ تو میں ضرور جاؤں گی۔“ موناکو کہنے لگی۔ ولید نے تاکید کی ہے کہ میں زخمی
فوجیوں کی دیکھ بھال میں لگا کر کروں۔ انہوں نے جاتے وقت مجھ سے جو آخری بات
کہی وہ تھی بھئی کہ۔ موناد عاکرنا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک پرم ویر چکر ولید احمد
کے نام بھی عبدالحمید خاں کے ساتھ شامل ہو جائے۔

کچھ دیر بعد میں موناکو سے رخصت ہو کر چلا آیا۔

چار روز تک میں مسلسل ولید کے کوارٹر جاتا رہا کہ موناکو کے احوال پوچھوں
لیکن معلوم ہوا کہ وہ کبھی بڑی رات کو لوٹ آتی ہے۔ کبھی نہیں آتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ
وہ ہسپتال میں ہی رہ رہی ہے۔ میا لکوٹ اور لائپلپور سکڑ پر گھسان لڑائی کی اطلاعیں
اخباروں میں آرہی تھیں۔ ولید کی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کس محاذ پر ہے۔ چار دن
تک موناکو سے ملاقات نہ ہوئی تو میں پانچویں دن فوجی ہسپتال پہنچا۔ اندر داخل ہونے
پر پابندیاں تھیں۔ ولید اور موناکو کے نام سے وہاں کام بن گیا۔ لیکن موناکو کی سہیلی
نرسوں نے بتلایا کہ لفٹننٹ ولید کے بے جگری بھائی بھادی سے لڑتے ہوئے شہید

ہو جانے کی خبریں عام تھیں۔ مونا کی حالت غیر تھی۔ وہ صحیحہ معلومات حاصل کرنے جانے کہاں کہاں گئی تھی۔

میرے دل پر کسی نے جیسے بھاری سی پتھر کی سل رکھ دی تھی۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اب تو رانی بند ہونے والی تھی، میں ٹکسی لیکر سیدھا کوارٹر پہنچا تو کوارٹر بند تھا۔ میں اپنے کمرے پر آیا کہ شاید مونا وہاں آئی ہو۔ لیکن وہ وہاں بھی نہ تھی۔ مجھ سے ایک جانے پہچانے آدمی نے پوچھا۔ ”نندین کہانی کا آپ ہی ہیں“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے تار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

فوجی محکمے نے مجھے خبر دی تھی۔ ”لفٹنٹ ولید زندہ ہیں۔ شدید زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن اب کوئی خطرہ نہیں، وہ یقیناً بچ جائیں گے۔ وہ چلہتے ہیں آپ مونا کے پاس رہیں۔“

ولید مجھے بڑا بھائی اور سرپرست مانتا تھا اور اسی لئے اس نے فوجی ریکارڈ میں بھی اپنے قریب ترین رشتہ دار کے طور پر میرا ہی نام لکھوا رکھا تھا۔ شادی کے بعد اسے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ میری جگہ اب مونا کا پتہ لکھوایا جاتا۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے احساس ہوا کہ ٹکسی چھوڑ کر میں نے غلطی کی ہے۔ اب یہاں در رنگ ٹکسی اسٹینڈ نہیں تھا۔ فاصلہ لمبا تھا۔ میں بھر ولید کے کوارٹر کا رخ کیا۔ رکھشا پر پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں بے تحاشہ لپک کر کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ میں مونا کو لپکارتا ہوا قاربا تھ میں تھا۔ برآمدہ سے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی میرا ماتھا ٹھنکا۔ مونا اس وقت نہیں سو سکتی۔ میں قریب پہنچا۔ سرخ نیچے پڑی ہوئی تھی اور

سربخ کی سوئی مونا کی رگ میں پھنسی ہوئی تھی اس نے مارو فیا اپنی رگ میں داخل کر لیا تھا اور ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔ سربخ کے پاس ایک کاغذ پڑا تھا۔ میں نے اٹھا لیا لکھا تھا نندو بھٹیا۔ اپنے ولید کے پاس جا رہی ہوں ولید کی لاش ملے تو ان کی قبر میری سادھی کے برابر بنانا۔ یہ میری آخری اچھا ہے۔

میں نے آہستہ سے مونا کی رگ میں پھنسی ہوئی سوئی نکال دی۔ جو شاید پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔ لیکن میں اپنے ولید سے کیسے کہتا کہ میں نے مونا کی خبر گیری کی ہے۔

اس کے پلنگ کے برابر صوفے کے ہتے پر گرکا ہوا میں سوچ رہا ہوں کہ وہ کہانی کس طرح شروع کی جائے جواب ختم ہو گئی ہے۔

صوفے پر اولن کے ننھے منے موزے اور لمبی لمبی سلاخیاں چھوٹے سے نامکمل سوٹر میں دھنسی پڑی ہیں۔ میرے ہاتھ میں ولید کا تار بھی ہے۔ مونا کا آخری خط بھی امداد ہر کوئی لا کر کسی اخبار کا ضمیمہ بیچتا ہوا۔ پکار رہا ہے کہ آج ساڑھے تین بجے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بند ہو گئی۔

ایک

خط

یادوں کے

نام

میری اپنی ذکیہ —

اس وقت جب کہ میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں آدھی رات گزر چکی ہے۔
 باہر کھولیں بادش ہو رہی ہے اور کھڑکیوں کے ٹین شیڈس پر اس پھوار کی آواز اتنی تیز
 بھی نہیں ہے جو کمرے میں ٹپک ٹپک کرتی گھڑی کی آواز پر سوتے پالے اور مجھے پل پل اڑتے
 ہوئے وقت کے تصور سے آزاد کر لے۔ کب سے سوچ رہی ہوں تمہیں کچھ لکھوں
 گی۔ دن ہینوں میں تبدیل ہوئے اور چھینے برس بن گئے۔ تم بھی ایک ہی بے دغا
 لکھیں۔ اپنی ساجرہ کو کبھی یاد کیا ہوتا۔

تم سے جدا ہوئی تھی تو تم نے گڑبڑوں کے گھروندے یہ کہہ کر دکھ لئے تھے کہ
 مجھے اپنے ننھوں ہی کو بہلانے کھلانے سے فرصت نہیں ملے گی میں بھلا ان گھرنڈوں کی کہاں
 حفاظت کر پاؤں گی۔ سو وہ تو ٹھیک ہی ہوا۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ اپنا کمرہ جو

اپنی چھوٹی سی دنیا کے لئے مختص تھا، جوں کا توں سجا رہے گا۔ میں بھی جب کبھی تم سے ملنے آؤں گی اس چھوٹی سی دنیا کے ہر ایک ساکھ سے پوچھوں گی کہ عمر کے چودہ برس ساتھ گزارنے کے بعد وہ مجھے بھلانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے۔ لیکن اب آؤں بھی تو کسی سے بھلا کچھ پوچھ سکوں گی؟ جب تمہیں نے یادوں کے دیئے بچھا دیئے ہیں۔

خیر ذکی چھوڑ دہی میں تو خود کو یہ سمجھا کر تسلی دے لوں گی کہ تم یونیورسٹی کو رس کے آخری سال میں ہو۔ تمہیں اپنی کتابوں سے فرصت ہی نہیں ملتی ہو گی ورنہ میری ذکی بھلا مجھے بھول سکتی ہے۔ ادیکھا تم نے۔ اب میں یادوں کے کھنڈر میں کہاں تک نکل آئی ہوں۔ تم مجھے بھول گئیں لیکن میں خود جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا رہی ہوں۔ اس فریب کھانے میں کیا کیا سکھ ملتا ہے۔ آئندہ ملتا ہے۔ ایسے میں بھلا کیسے مان لیتی کہ تم مجھے بھلا بیٹھی ہو۔

جینے کا قرینہ کوئی ہم بیاہتا عورتوں سے سیکھے۔ جو اپنا ہے سو اپنا ہے ہی۔ اور جو اپنا نہیں ہے سو بھی اپنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ تب ہی تو کہیں گھر بستا ہے۔

سو جیتی ہوں ذکی تجھ سے کتنی ہی باتیں کر لوں۔ پتہ نہیں پھر کبھی وقت ملے نہ ملے۔

باہر بانش تیز ہو گئی ہے اور کھڑکیوں کے ٹین شیڈس پر اس کی آواز مجھے اکھرنے لگی ہے۔ کبھی کبھی یہ آواز اتنی بڑی بھی نہیں لگتی۔ نیم خوابی کے عالم میں تو جیسے کوئی جلتا ہوا پتھر دیتا ہے اور یہی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ لیکن جانے کیوں یہ آواز اب مجھے نہ بھائی۔ شاید اسی لئے میں جاگ

رہی ہوں — ذکی تو نے کیوں یہ بات سوچی ہوگی کہ اکیلے جاگتے رہنے میں رات کے سناٹے بولنے لگتے ہیں اور جب گھڑی کی ٹیک ٹیک سے ٹوٹتے ہیں تو مانو یا دوں کی کرچیاں چیاں سی بکھر جاتی ہیں جنہیں ہم جوں بھی نہیں پاتے، بس دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ زندگی میں اکیلے جاگتے رہنا کتنا مشکل ہے — خدا نہ کرے جو کبھی تیری سمجھ میں یہ بات آ سکے۔

میں تو تجھ سے یہ کہنے چلی تھی کہ میرے کمرے کی اس ٹیک ٹیک کرتی ہوئی گھڑی کو کوئی خاموش کر دے — اور اب جبکہ ٹین شیڈس پر بارش کی آواز نے شور مچا کر گھڑی کی اس ٹیک ٹیک کو میرے کمرے سے نکال دیا ہے تو میں بوکھلا گئی ہوں حالانکہ وقت ٹھہر نہیں گیا ہے وہ کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے۔ لیکن وہ جو میں نے اپنے سینے کے اندر دل کے نام سے ایک گھڑی چھپا رکھی ہے۔ اس کے چلنے اور بند ہونے تک میں اکیلی ہی جاگتی رہوں گی — گو میں تھک گئی ہوں گی — گو میں تھک گئی ہوں — واقعی تھک گئی ہوں — ذکی۔

اپنی ہستی دوسرے پر بچھا کر رکھنے میں بھی کیسے کیسے مزے ملتے ہیں — سب کچھ پرایا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا آپا بھی پرایا — میں ذات سے جیسے کچھ ہوں وہی نہیں — دوسرے کے لئے سب کچھ ہو جانا اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رہنا کوئی اس دھرتی سے سیکھ جس کا سینہ چیر کر بیچ بونے پر کوئلیں چھوڑتی ہیں، فصلیں پہلپھاتی ہیں — میں بھی بس دھرتی بن گئی ہوں ذکی — روند کر کوئی چلتا ہے تو آواز نہیں کرتی۔ جھک کر کوئی ماتھا ٹیکتا ہے تو اوپر نہیں اٹھ جاتی۔

لو — ذرا اس ننھے کو تھپک کر سلام دوں، ذرا اس کی آنکھوں

میں پھر سے زندیا گھلا دوں تو تم سے باتیں کروں — ابھی ابھی مشکل سے اس کو
 سلا سکی تھی۔ یہ بڑا صندی ہے۔ مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔ رور و کر خود بھی ہلکا
 ہوتا ہے۔ میرا گوشت پوست میرا لہو، میرا سکھ چین، میری نیند غرض کہ میرا وجود تو
 بس اس کا ہو کر رہ گیا ہے۔ گویا میں اپنی بقیہ نصف مہتی دوسرے میں تقسیم کرتی پھر
 رہی ہوں۔ یہ دوسرے بھی کون ہیں — میرے اپنے ہی تو ہیں — میری جو بیٹیاں
 نازکی، اس میں پھر اتنی سمجھ ہے کہ چھوٹے بھائیوں پر پچھا در ہوتی ہوئی محبت کو محسوس
 کرتی ہے تو برہم نہیں ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی خود بھی اس ننھے صندی کو چپکا لیتی ہے۔
 یا شاید یہ بھی اس لئے ہے کہ اس نے عورت کا جنم لیا ہے۔ لیکن اس ننھے سے
 جو بڑا ہے وہ تو بعض وقت جلاپے میں میری گود سے ننھے کو کھینچ لیتا ہے۔
 میری نظر بچا کر اس کی ٹھکانی کر دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ خود مجھ پر بھی تو ننھے ننھے
 ہاتھوں سے ماروں کے پھول برس جاتے ہیں اور میں ان ہاتھوں کو چوم چوم کر رہ جاتی
 ہوں۔ یہ برہمی دراصل احتجاج ہے کہ میری وہ محبتیں جس کا یہ صندی ننھا بلا شرکت
 غیرے مالک بن بیٹھا ہے اس میں اس کا اپنا بھی تو حق ہے اور میں گویا حقوق کا تحفظ
 نہیں کر رہی ہوں۔

تمہیں ایک دلچسپ بات سناؤں۔ شاید تم ہنس پڑو گی یہ محبتیں حاصل
 کرنے میں سبقت لے جانے کی دوڑ شاید آدمی کی فطرت ہے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ
 خود وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ اس خفگی اور ناراضگی کا سبب جانتی ہو کیا تھا
 — یہی کہ میں بالکل بچوں کی ہو رہی ہوں اور ان کی طرف توجہ کم کرتی ہوں۔ گویا
 وہ بھی اس مقابلے کی دوڑ میں بیٹھا اور منجھلے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے۔ جب

ان کے تیور اس طرح دیکھتی ہوں تو سب کو چھوڑ کر ان کی دلداری کرتی ہوں۔
 میں کبھی کبھی سوچتی ہوں ذکی کر اپنی ہستی کو اُٹے ہوئے بادل کی طرح
 بنا لیتا ہی شاید عورت پن ہے — پودوں کو دھوپ جھلس رہی ہو تو سیاہ بن
 گئے اور اگر ان کی جڑیں سوکھ رہی ہوں تو برس پڑے۔ اب اس برس میں یہ تخصیص
 تو ممکن نہیں ناکہ کس ننھے پودے کی قسمت میں کتنا جل اُگیا ہے اور کس تناور درخت
 کے سچے میں کتنا پانی۔

اب تم کو خط لکھ کر پڑ رہوں گی۔ پتہ نہیں تم جواب دو گی بھی یا نہیں —
 جو بھی رات کی رات مجھے تمہارے اپنے بارے میں سوچ لینے دو — صبح ہوگی تو
 پھر مجھے کتھاں ہے گی — سوچ کی کرنیں میری زندگی میں اُجالے کے ساتھ ساتھ اتنی
 مصروفیتیں بھی لے آتی ہیں کہ میں نشین بن جاتی ہوں — رات ہوتی ہے اور ننھا ہلکا
 کمر کمر کے سو جاتا ہے تو پھر رات گئے کوئی گوشت پوست کی عورت میرے وجود میں
 بیدار ہوتی ہے اور وہی بانہہ پکڑ کر مجھے تجھ بے وفائیک لے جاتی ہے اور میں
 تجھ سے میلوں دور رہ کر کبھی پیر دبا کر جب تیرے کمرے میں پہنچتی ہوں تو، تو مدقاتی
 نیند کی آغوش میں ایسی بے مددہ ہوتی ہے کہ نہ تجھے اٹھائے ننتی ہے نہ تجھ سے بات
 کئے — میں گھر بھر میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو دیکھ کر لوٹ آتی ہوں — کبھی کبھی
 تو مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے — کسی نے — کسی نے مجھے پہچانا نہیں —
 اب یوں بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے — سوچ تو بھلا — کیا بیت جاتی ہوگی۔
 سو سو بہانے کر کے بھی کسی کو دل سے نہ نکال سکے — جتنا جھلنا چاہا اتنے ہی مجبور
 ہو گئے — تھک ہار گئے تو بوجھل قدموں سے وہاں تک جا پہنچے کہ چلو ذرا کی

ذرا دیکھ آئیں کہ اسی درشن کے سہارے باقی زندگی بتائیں گے۔ اور جب سامنے پہنچے میں تو کسی نے اس طرح دیکھا جیسے کہیں دیکھا تھا۔ اور۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اُف۔ اس کے بعد زندہ رہنا کوئی آسان بات ہے۔ اُکی۔ اسی لئے تو میں تجھ تک آنے سے ڈرتی ہوں۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی جان اور پھر میں تو وہ عورت ہوں جو لٹ چکی میری اپنی زندگی، میری اپنی ہے ہی کہاں۔ یہ صندی ننھا اس کا مالک ہے، ٹھکانی کرنے والا مینچلا اس کا مالک ہے، مٹ مٹ تنکنے والی بٹیا اس کی مالک ہے اور سہارے لئے دن رات محنت کرنے والے وہ اس کے مالک ہیں۔ اپنا کچھ بیچ رہے تو اسے سو سو جتن سے چھپا کر تجھ تک لے آؤں بھی تو وہ اتنا بھی نہیں ہے کہ کسی خالی جھولی کے کونے ہی کو پر کر سکے۔ اب ایسے میں وہ چیز جو کسی خالی جھولی کے قابل بھی نہیں ہے۔ تیرے خزانے میں بھلا نظر بھی آ سکے گی؟

اے یہ گھڑی کی ٹیک ٹیک پھر مجھے ستانے لگی۔ ٹین شیڈس خاموش ہیں۔ بارش تھم چکی ہے۔ ننھا سوراہے گھر کا گھر جیسے نیند کی آغوش میں ہے۔ میرے قدم پھر تیرے آنکھن تک مجھے لے آئے ہیں، ننھا میری گود میں ہے اور میں بیچ آنکھن میں گھڑی سوچ رہی ہوں۔ وہ جو کمرہ ہے جس کی کھڑکیوں کے ہمیں پردوں سے ہری ہری روشنیاں چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہی ہیں، اس کمرے میں چپکے سے داخل ہو جاؤں اور تیری بھابی کے پہلو میں بٹھے کو سلا کر بے پاؤں والیس لوٹ آؤں۔

اور اگر ایسے میں وہ جاگ کر مجھ سے پوچھے تو اسے بتا دوں کہ

تمہارا شوہر جھوٹ کہتا ہے — میں جانتی ہوں — میں جانتی ہوں —
 اُسے تو ٹوکروں بچوں کی خواہش تھی — تم اس ننھے ہی کو رکھ لو۔
 — اور اگر ذکی، تیری کہاں پوچھ بیٹھ کہ بتاؤ کیا قیمت لوگی تو میں کیا
 کہوں گی — تو ہی بتا، میں کیا کہوں —

میں کہوں گی — میں کہوں گی — اپنی اتنی ساری کاروں میں
 سے کسی کار میں بیٹھا کر مجھے خوب گھماؤ، پھر آؤ — میں تھک گئی ہوں — بہت
 تھک گئی ہوں۔ جب فوراً زندگی کم ہو، تھکن دور ہو تو کسی نامعلوم موٹر پر مجھے اُتار دو
 ایسے موٹر پر جہاں سے راستے ملیں نہیں — ڈھونڈنے میں عمر کٹ سکے۔

۲۷ اب میں چلتی ہوں — رات بہت بیت چکی ہے — ننھا
 جاگ گیا ہے — تو اس خط کی رسید مجھے دے گی نا؟ — کیونکہ اب
 میں تجھے پھر کبھی کچھ نہیں لکھوں گی — یہ خط تیری اپنی مرحوم سائمرہ کا پرہ
 بھی ہے۔

ادھر آ — ذرا اور قریب آ — اور قریب — تجھے بتا دوں
 کل میں نے تیرے بھیا کی تصویر جلا دی ہے — ہاں —
 جلا دی ہے — بیٹیا بڑی ہو رہی ہے — اب میں کہاں اس تصویر
 کی حفاظت کر سکوں گی — اچھا چلوں اب — ہمیشہ تیری اپنی سائمرہ

تعارف نامہ

نام :-	سید مسیح الدین
عرف :-	اقبال
تخلص :-	اقبال متین
والد کا نام :-	سید عبدالقادر صاحب (مرحوم)
تاریخ پیدائش :-	۳۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء
مقام پیدائش :-	فرحت منزل، رام کوٹ، شہر حیدرآباد (بھارت)
تعلیم :-	انسٹر میڈیٹ
درس گاہیں :-	مدرسہ دستانیہ بشیر آباد (نادنگی)
	مدرسہ فوقانیہ چیتا پور
	سٹی ہائی اسکول حیدرآباد
	ایم۔ اے۔ او۔ انسٹیٹیوٹ، عابدس، حیدرآباد
	سٹی کالج حیدرآباد
	دارالعلوم کالج حیدرآباد
	چادر گھاٹ کالج حیدرآباد

پہلی کہانی :- چوڑیاں - ادب لطیف، لاہور جون ۱۹۴۵ء
 پہلی نظم :- کب تک - سب سے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
 پہلی کتاب :- اُجلی پرچھائیاں - ۱۴ افسانے - اگست ۱۹۶۰ء

مطبوعہ تصانیف

- (۱) اُجلی پرچھائیاں (افسانے) ۱۹۶۰ء
 (آئندہ پریش ہندی سہتیہ اکاڈمی ادارہ)
 (۲) بچا ہوا البم (افسانے) ۱۹۹۳ء (آئندہ پریش اردو اکاڈمی ادارہ)
 (۳) چراغِ تہہ و اماں (ناول) ۱۹۷۶ء
- حیدرآباد کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانشوروں کی جانب سے ۲۵/ دسمبر ۱۹۷۷ء کو لاہور میں ہالِ انوار العلوم کالج حیدرآباد میں ناول کی پذیرائی میں خبرِ قدیمی جلسہ کثیر زر کی شیکشی اور آئندہ پریش اردو اکاڈمی کی دھاندلی پر احتجاجی تقاریر کے جس کے بورڈ نے اس ناول کو UNIQUE قرار دے کر انعامِ اول کے لئے نامزد کیا۔ لیکن اس بابِ نظم و نسق نے خوش قرار دیکر انعام سے محروم رکھا۔ پروفیسر عالم خود میری کا احتجاجاً استعفاء۔ ہندوستان کے بیشتر ادبی جرائد میں احتجاجی ادارے اور مضامین۔

(۴) خالی پیاریوں کا مداری

(افسانے) ۱۹۷۷ء

(آنڈھرا پردیش اردو اکادمی)

(۵) آگہی کے ویرانے

(افسانے) ۱۹۸۰ء

(آترپردیش اردو اکادمی)

(۶) منزلہ

(افسانے) ۱۹۸۹ء

شائع کردہ آنڈھرا پردیش

• ادبی خدمات کے اعتراف

شاعروں اور دانشوروں کی حیا

تقریباً تقاریر اور گراں قدر کہ

۹/ دسمبر ۱۹۸۹ء بہ مکان محمد

ہمدی پٹنم - حیدرآباد (ہند)

• ادبی ٹرسٹ کا تحفہ اعتراف

• آترپردیش اردو اکادمی

(ج) میں فسانہ تم بھی کہانی

(افسانے) دسمبر ۱۹۹۳ء

ان کے علاوہ توصیف نامے (اسنادات)

- ★ آترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ - سند اور رقم (۳۰۰۰)
- ★ سلطان العلوم ادارہ - سند اور مومنٹو برائے سا
- ★ آنڈھرا پردیش اردو اکادمی - ادبی خدمات توصیف نامہ اور
- اور مومنٹو ۱۹۹۳ء

ادبی انجمنیں

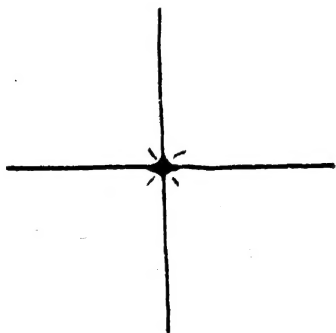
- (۱) سابق نائب صدر۔ انجمن معمارِ ادب حیدر آباد
(۲) سابق صدر۔ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش

ادارت

- (۱) سابق نگران ماہنامہ گلپانگ ادب (ممبئی)
(۲) مدیر برائے جنوبی ہندسہ ماہی تناظر (نکسش انتھالوجی) افسانوی
انتخاب (دہلی)

پتھر :-

اقبالِ مبین ”کہانی“ کتاب نگر۔ نظام آباد (اے پی)
۵۰۳-۰۱ - انڈیا



مصنف کی زیر طبع کتابیں

- ۱) صریر جاں (شاعری)
- ۲) صنم گدہ (خاکے)
- ۳) باتیں ہماریاں (یادیں)
- ۴) بے دلی اپنا پتا پوچھے ہے (افسانے)
- ۵) آننگن میں سہاگن (طویل مختصر افسانے)
- ۶) تار تار (افسانے)

کیسٹس cassettes

- ۱) ہر اس منظم کہانی اور دوسرے افسانے (۶۰ منٹ) اقبال متین
- ۲) صریر جاں غزلیں (اقبال متین)
* موسیقار :- حبیب علوی .. (۹۰ منٹ)
- ۳) صریر جاں غزلیں (اقبال متین)
* موسیقار :- مرزا مقصود بیگ .. (۹۰ منٹ)

